ماہنامہ

پیامِ عرفات

رائے بریلی

اجتماعی روزہ کی حکمت

"ایک ہی وقت میں تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے روزہ رکھنے میں بڑی حکمت ہے۔ مسلمانوں کی بڑی جماعت کا فریضۂ صیام کو اہتمام کے ساتھ ایک وقت میں ادا کرنا، کمزور طبیعت والوں کے لیے بھی ہمت افزا، شوق انگیز اور فریضہ کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے، ایک عالم گیر روحانی ماحول اور ایک عمومی دینی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جو قلوب و ارواح کے لیے موسم بہار کی سی تاثیر رکھتی ہے، جس میں تھوڑی توجہ سے ہر چیز میں نشو و نما پیدا ہونے لگتا ہے۔ مسلمانوں کے اس روحانی فریضہ میں مشغول ہونے سے ملکوتی انوار و برکات کا نزول ہوتا ہے اور عوام کے آئینۂ دل پر انوار کا انعکاس ہوتا ہے، مسلمان عالم کے جس گوشے میں بھی ہو، اس کو روزہ دارانہ فضا معلوم ہوتی ہے، جو اس سے خود ہی تقاضا کرتی ہے کہ وہ بھی روزہ دار ہو۔ مسلمان روزہ شکنی کر کے اپنے کو اس ماحول میں اجنبی اور ایک طرح کا مجرم سمجھتا ہے۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جب چاند دیکھیں تو یہ دعا پڑھیں
”اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَ الْاِیْمَانِ وَ السَّلَامَۃِ وَ الْاِسْلَامِ، رَبِّیْ وَ رَبُّکَ اللّٰہُ، ھِلَالَ رُشْدٍ وَ خَیْرٍ“
افطار سے پہلے کی دعا
”یَا وَاسِعَ الْفَضْلِ اِغْفِرْ لِیْ“
افطار کی دعا
”اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَ عَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ“ یا ”ذَھَبَ الظَّمْأُ وَ ابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ“
جب کسی کے یہاں افطار کریں
”اَفْطَرَ عِنْدَکُمُ الصَّائِمُوْنَ وَ اَکَلَ طَعَامَکُمُ الْاَبْرَارُ وَ صَلَّتْ عَلَیْکُمُ الْمَلَائِکَۃُ“
تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد یہ دعا پڑھیں
”سُبْحَانَ ذِي الْمُلْکِ وَ الْمَلَکُوْتِ، سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّۃِ وَ الْعَظَمَۃِ وَ الْھَیْبَۃِ وَ الْقُدْرَۃِ وَ الْکِبْرِیَاءِ وَ الْجَبَرُوْتِ، سُبْحَانَ ذِي الْحَيِّ الَّذِيْ لَا یَنَامُ وَ لَا یَمُوْتُ، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَ رَبُّ الْمَلَائِکَۃِ وَ الرُّوْحِ، اَللّٰھُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ، یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ“
جب اعتکاف کی نیت سے مسجد میں داخل ہوں
”بِسْمِ اللّٰہِ دَخَلْتُ وَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ نَوَیْتُ سُنَّۃَ الْاِعْتِکَافِ“
شبِ قدر کی دعا
”اَللّٰھُمَّ إِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد:۱۱ — مئی-جون ۲۰۱۹ء - رمضان المبارک-شوال المعظم ۱۴۴۰ھ — شمارہ: ۵-۶

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

روزہ کی حالت میں جھوٹ کا وبال

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم:

”مَنْ لَمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ أَنْ یَدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(جو شخص (روزہ کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے)

(صحیح البخاري، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور والعمل بہ في الصوم)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.10 — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

مبارک ایام (اداریہ)..... ۳

بلال عبدالحی حسنی ندوی.....

عبادات کا لازم ومتعدی پہلو..... ۴

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ.....

قرآن مجید کا مقام اور اس کا پیغام..... ۷

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ.....

آئینۂ نبوی ﷺ..... ۱۰

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ.....

دین کے قلعے کی فصیلوں کو مضبوط کرو..... ۱۲

مولانا عزیز الحسن صدیقی.....

ایثار ومواسات کیا ہے؟..... ۱۴

بلال عبدالحی حسنی ندوی.....

ذلیل اور رسوا قوم..... ۱۷

عبدالسبحان ناخدا ندوی.....

رمضان المبارک - چند احکام ومسائل..... ۱۹

ادارہ.....

زکوٰۃ کے مصارف..... ۲۱

مفتی راشد حسین ندوی.....

روزہ کے جسمانی وروحانی فائدے..... ۲۴

حکیم قاضی خالد، ایم.اے.....

تجارت نبوی (ﷺ) کی نوعیت..... ۲۷

محمد ارمغان بدایونی ندوی.....

مسلمانوں کا عروج اور اس کے بنیادی اسباب..... ۲۸

محمد نفیس خاں ندوی.....

دردِ معاصی کی دوا

نتیجۂ فکر:- علامہ سید سلیمان ندویؒ

عشق نبویؐ دردِ معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمع ہدیٰ ہے

پڑھتا ہے درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق
تصویر پہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے

نور نبویؐ مقتبس از نورِ خدا ہے
بندہ کو شرف نسبت مولا سے ملا ہے

احمدؐ سے پتہ ذات احد کا جو ملا ہے
مصنوع سے صانع کا پتہ سب کو چلا ہے

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت
جو پیروِ احمدؐ ہے وہ محبوب خدا ہے

آمد تری اے ابر کرم رونق عالم
تیرے ہی لیے گلشن ہستی یہ بنا ہے

فردوس و جہنم تیری تخلیق سے قائم
یہ فرق بد و نیک ترے دم سے ہوا ہے

فرمان دو عالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے

لے جائے گا منزل سے بہت دور بشر کو
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

مدیر کے قلم سے

مبارک ایام

بلال عبدالحی حسنی ندوی

قیامت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ زمانہ سمیٹ دیا جائے گا، سال ایک مہینہ اور مہینہ ایک ہفتہ معلوم ہوگا، زمانہ کی برق رفتاری اس کی غماز ہے، کس طرح سال وماہ گذر رہے ہیں، اس کو ہر شخص محسوس کر رہا ہے، رمضان کا یہ مبارک مہینہ جس کا لمحہ لمحہ خیر و برکت ہے، کس طرح تیزی کے ساتھ گذر رہا ہے، لگتا ہے کہ سوچنے کی بھی مہلت نہیں، ذرا سی غفلت کتنی بڑی محرومی کا ذریعہ بن سکتی ہے، پلک جھپکی اور ہلال عید سامنے۔

ضرورت تو اس کی تھی کہ رمضان سے پہلے ہی پورا نظام بنالیا جاتا اور ایک ایک لمحہ کی قدر ہوتی، دنیا کے کاموں کو پہلے ہی سے ٹھکانے لگا دیا جاتا، مگر اب جو وقت بھی رہ گیا ہے، اس کو غنیمت سمجھا جائے اور تلافی کی کوشش کی جائے، جو لوگ پہلے سے تیاری کر لیتے ہیں، اور دل کی زمین کو رحمت الٰہی کے قابل بنا لیتے ہیں، ان پر پہلے دن اور پہلے لمحہ سے رحمتوں کی بارش ہوتی ہے، وہ منٹوں اور سکنڈوں کا حساب کرتے ہیں، ایک لمحہ بھی غفلت میں نہ گذرنے پائے، یہ خاص کمائی کا زمانہ ہے، وہ بولتے ہیں تو تولتے ہیں، کوئی بات نامناسب زبان سے نہ نکل جائے، غیبت، چغلی، بدگوئی، فحش گوئی کا تو سوال ہی نہیں، لایعنی سے بھی اجتناب، وہ اپنے عمل کا حساب لیتے رہتے ہیں، بلکہ بہتر سے بہتر کی طرف ان کا سفر جاری رہتا ہے۔

جو پہلے سے فکر نہیں کرتے وہ اکثر پورا مہینہ غفلت میں گذار دیتے ہیں، روزہ کاٹنے کے مشاغل تلاش کرتے رہتے ہیں، یہ مبارک مہینہ ان کو بوجھ محسوس ہوتا ہے اور بہت سے محروم القسمت وہ بھی ہوتے ہیں جن کے رمضان اور غیر رمضان میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا، نام مسلمان کا لیکن کام غیروں کے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ مہینہ امت کی فلاح و بہبود کے لیے رکھا ہے، اس کے ذریعہ سے سال بھر کا کوٹا حاصل ہوتا ہے، یہ ایک مہینہ کی محنت سال بھر کام آتی ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ، امام سرہندیؒ نے لکھا ہے کہ جس کا رمضان اچھا گذر گیا، اس کا پورا سال اچھا گذرتا ہے۔

یہ مہینہ ذکر و تلاوت کا ہے، دعا و مناجات کا ہے، غمگساری و ہمدردی کا ہے، اس کو حدیث میں "شہر المواساۃ" کہا گیا ہے، اس مہینہ میں اللہ نے روزے اس لیے فرض کیے تاکہ مزاج میں تقوی پیدا ہو، اور آدمی احتیاط کی زندگی گذارنے کا عادی بنے، جو اللہ کے لیے جائز و حلال چیزیں چھوڑ رہا ہو، وہ حرام و مشتبہ چیزوں کو کیسے اختیار کر سکتا ہے، روزوں سے اپنے نفس پر کنٹرول کرنے اور اس کو قابو میں رکھنے کی مشق ہوتی ہے، اور یہ مشق اس کی زندگی میں ڈھال کی طرح ثابت ہوتی ہے، وہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو شیطانی حملوں اور نفسانی چالوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

جتنے بھی ایام اس مبارک مہینہ کے باقی ہیں، ان کو بہتر سے بہتر گزارنے کی کوشش کی جائے، تاکہ یہ مہینہ ہم سے راضی ہو کر جائے اور ہم اس بددعا کے مستحق نہ ہو جائیں جو آپ ﷺ نے اس شخص کو دی ہے جس سے یہ مہینہ ناراض ہو کر جاتا ہے۔

عبادات کا لازم اور متعدی پہلو

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

نماز کا لازم اور متعدی پہلو

ہر چیز میں ایک چیز لازم اور ایک چیز متعدی ہوتی ہے، طلبہ تو ان اصطلاحوں کو اچھی طرح جانتے ہوں گے، لازم تو یہ ہے کہ اس کا عمل اسی تک محدود رہ جائے، اس سے متجاوز نہ ہو، نماز کا لازم یہ ہے کہ نماز میں کَأَنَّهُ يَرَاكَ کا منظر ہو، احسان کی صفت نماز کے اندر پیدا ہو جائے، اگر یہ خدا کو نہ دیکھے تو خدا اسے دیکھ رہا ہے، یہ خیال دل میں پیدا ہو جائے، یہ نماز لازمی ہے۔ اور ایک نماز متعدی بھی ہے اور وہ کس طرح؟ دو طرح سے نماز متعدی ہے، ایک نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے متعدی ہے، اور دوسرے دوسرے کے لحاظ سے بھی نماز متعدی ہے، نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے نماز کا تعدیہ یہ ہے کہ {إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ} نماز جب ختم ہو جاتی ہے تب بھی متعدی رہتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ نماز نماز پڑھنے والے کو فحشاء سے روکتی ہے، متعدی نماز سے اس بات کی توقع ہو جاتی ہے کہ وہ نماز پڑھنے والے کو گناہ سے روکے گی، تو متعدی نماز کے لیے یہ معیار مقرر کیا ہے، {إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ} کہ نماز ہو تو گناہ نہ ہو، اور اگر نماز پڑھنے کے بعد نفس کی ترغیب رہی اور یہ گناہ کی طرف چل پڑا تو یہ نماز لازمی ہے متعدی نہیں ہے، اگر نماز پڑھنے والا گناہ سے رک گیا تو یہ نماز متعدی ہے نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے۔

پھر اگر یہ نماز میں زیادہ متعدی کی صفات ہوں تو یہ اس پر ہی انحصار نہیں ہے کہ وہ نماز خود گناہ سے روکتی ہے بلکہ اگر نماز صحیح ہو جائے تو یہ نماز وہاں کے ماحول سے ٹکراتی ہے اور وہاں کے ماحول اور نماز کے مابین جنگ ہوتی ہے، پھر یہ نماز اصلاح، تذکیر، محاسبہ اور احتساب پر آمادہ کرتی ہے، اسی لیے آپ دیکھئے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام کو دیکھا کہ ان میں اور قوم میں کیا فرق ہے؟ یہ جو حلال و حرام میں اور فساد اور صلاح میں اور خدا کی اطاعت اور معصیت پر اور مسئلہ اور غیر مسئلہ پر فرق کو معلوم کیا تو ان میں سے بعض فراست والوں نے سمجھ لیا کہ ان میں یہ چیز پیدا کرنے والی نماز ہے، وہ یہ سمجھ گئے اور کہنے لگے {يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا} [ہود: ۸۷] کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز اس سے روکتی ہے؟ اور قرآن نے ان کے اس سوال کی تردید نہیں کی، اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں، یہ متعدی ہونے کا دوسرا پہلو ہے، پہلا متعدی پہلو یہ ہے کہ نماز نماز پڑھنے والے کو بے حیائی سے روکتی ہے، پھر دوسرا متعدی پہلو یہ ہے کہ وہ نماز دوسروں کو برائی سے روکنے والی بنتی ہے، ورنہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ان کو نہ پہچانتی، لیکن یہ پہچان لینا کہ اس نماز نے ہی حضرت شعیبؑ کو ہم سے الگ کر دیا ہے، یہ متعدی پہلو ہے۔

زکوۃ کا لازم اور متعدی پہلو

اسی طرح زکوۃ ہے، زکوۃ کا ایک تو لازمی پہلو ہے کہ اس سے فرض ساقط ہوتا ہے، اور دوسرا متعدی پہلو یہ ہے کہ وہ مال کا تزکیہ کرتی ہے، لفظ زکوۃ خود صاف کرنے کو بتلاتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ زکوۃ مزکی ہے مال کا، پہلے زکوۃ نے مال کو مزکی کیا، پھر انسان کو مزکی کیا، اور پورے ماحول کو ٹھیک کیا، اور پھر پورے علاقہ کے فساد کو دور کرتی ہے، آپس کی جنگ کو دور کرتی ہے، عداوت اور دشمنی کو دور کرتی ہے، آپس میں صلاح پیدا کرتی ہے، یہ جتنی دنیا میں پارٹیاں بن رہی ہیں، وہ سب مال کی حرص کا نتیجہ ہے، اور یہی عداوت کا سبب ہے، اگر دنیا کے

سارے انسان مال کا تصرف صحیح کریں تو یہ تمام خطرہ اور تمام فساد اور سارے انتشار اور یہ تمام طبقاتی عناصر اور تمام کشمکش ختم ہوجائے۔

حج کا لازم اور متعدی پہلو

اب آیئے حج کی طرف، حج لازم بھی ہے اور حج متعدی بھی، حدیث میں آتا ہے کہ جس کا حج مقبول ہوگیا وہ گویا وہ ابھی پیدا ہوا ہے، یہ تو اس کا لازم ہے، اور حج کا تعدیہ اور نفع یہ ہے جسے خدا فرماتا ہے: {لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ} اگر حج صحیح ہے تو وہ حج زندگی پر اثر ڈالے گا، حج کا اثر صرف ماضی سے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ حال اور مستقبل سے بھی متعلق ہے، اسے بھی وہ حج متاثر کرے گا، اور روحانیت میں ترقی اور حالات میں تبدیلی پیدا کرے گا، اور پھر وہ حج سارے مفاسد، بدمعاملگی، بے وفائیوں اور برائیوں کو دور کرنے والا ہوگا، حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اگر حج ہمارا صحیح ہوتا تو دنیا کے معاملے ہی کچھ اور ہوتے۔

حج کے صحیح ہونے پر تعدیہ یہ تھا کہ پہلے حاجیوں کے قافلوں کے گزرنے پر لوگ اسلام لایا کرتے تھے اور اب معاملہ بالکل برعکس ہے، آج تو حال یہ ہے کہ حاجی جدھر سے گزرتا ہے حق تعالیٰ ہی معاف فرمائیں اور کوتاہیوں پر درگزر فرمائیں، ان کے گزرنے پر غیر مسلم اسلام تو کیا لاتے اسلام سے ہی دوری اختیار کرلیتے ہیں، گویا حج ان کے اسلام سے دور ہونے کا ذریعہ ہورہا ہے، بندرگاہ پر جاکر آپ دیکھیے وہاں کے لوگ اچھے اچھے لوگوں سے بھی یہ کہتے ہیں کہ ہم کو اب کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا، آپ بھی اپنی تلاشی کروائیے۔

رمضان کا لازم اور متعدی پہلو

اسی طرح رمضان کا بھی ایک لازم اور متعدی پہلو ہے، رمضان کا لازم یہ ہے کہ حدیث میں ہے: مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ کہ جس شخص نے روزہ رکھا ایمان اور احتساب کی شرط کے ساتھ اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں

اور رمضان کا تعدیہ یہ ہے کہ بعد کے مہینہ اور رمضان کے بعد کے اوقات میں بھی گناہ سے بچنا چاہیے، صاحب معاملہ یعنی خریدار ہیں یا بیچنے والے، حاکم ہیں یا محکوم، امیر ہیں یا غریب، متعلم ہیں یا معلم، کاشتکار ہیں یا تاجر، ہر حال میں یہ بات ہو کہ آپ روزہ دار کی طرح ہوں، جس طرح نماز کی علامت پیشانی پر ہے اسی طرح پیشانی پر ایسا نور ہو کہ جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ کا روزہ ہے، آپ کا لینا دینا اور گھر کے معاملات اور برتاؤ بھی شہادت دے رہے ہوں اور روزہ کی تاثیر اور روزہ کی حقیقت کا کہ ہمارے روزے قبول ہیں، یہ روزہ کا تعدیہ ہے۔

بعض لوگ رمضان تک کا روزہ رکھ لیتے ہیں، یعنی رمضان تک گناہوں سے بچ جاتے ہیں، پھر رمضان کا تعدیہ ختم کردیتے ہیں، گویا رمضان کی ایک شخصیت تھی پھر رمضان کے بعد دوسری شخصیت آگئی، یہ اوپر کا طبقہ ہے، لیکن یہ بھی کوئی اعلیٰ نہیں، رمضان کی نورانیت اور برکت رمضان تک باقی رہے، یہ تو لازمی پہلو ہے، لیکن اس کا متعدی پہلو یہ ہے کہ اس کا اثر پورے ماحول میں پہنچے، اور پورے ماحول میں اس کی خوشبو پھیلے، اور سب کو یہ معلوم ہو کہ انھوں نے روزہ رکھا تھا، اور روزہ رکھنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو ان کے پیر نے اجازت دیتے ہوئے جو وصیت کی تھی وہ یہ تھی کہ حق کی ادائیگی کی جائے، چنانچہ جب دہلی آئے تو ایک طالب علم کی ایک کتاب کا حق تھا، کتاب خرید کر اور جلد بندھوا کر اسے حوالہ کی، دوسرے بزاز کے چند پیسہ تھے، بہت دن ہوگئے تھے، اسے بھی وہ پیسے یاد نہ ہوں گے، اور حضرت کے پاس پیسے جمع ہونے کا سوال ہی نہیں تھا، پھر بھی جمع کرکے لے گئے اور اسے جا کر دیا، اس پر اس بزاز نے جو مسلمان نہیں تھا جو بات کہی وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، اور دل پر لکھ لینے کے قابل ہے، اس نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، حالانکہ دہلی میں اسلامی حکومت تھی، اور سارے ہی مسلمان تھے، لیکن ان مسلمانوں سے پہلے جو اجودھن پر حکومت کرنے والے تھے، ان کا بھی یہی

حال تھا، تو مسلمان اور ان پہلے غیر مسلمان میں کوئی فرق نہیں تھا، تو مسلمان اور پہلے بھی یہاں تھے لیکن اب جو ان کے حالات میں تبدیلی آئی ہے وہ کسی سچے مسلمان کے پاس جانے سے ہی آئی ہے، یہ اس غیر مسلم نے سمجھا، اب آج کے مسلمان کا حال بازار میں جا کر دیکھیں کہ مسلمان کے بارے میں ایک تاجر اور کاشتکار اور بازار کے انسان کا کیا خیال ہے، آج ہر اعتبار سے کوئی ہمارے پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں۔

حضرات! میں کیا کہوں، میرا منہ تو ہے نہیں کہ کچھ کہہ سکوں، آج جو حالات دنیا میں ہو رہے ہیں وہ آنے والے نہیں بلکہ خود ہماری مسجدوں سے باہر آ گئے ہیں، وہ سارے حالات غفلت کے اور الحاد اور بے دینی کے اور دینی استخفاف کے اور میں آگے بڑھ کر کہوں کہ ایسے احوال پیش آ رہے ہیں کہ مشکل سے کوئی دین پر باقی رہے، حدیث کے فرمان کے مطابق دین پر باقی رہنا ہتھیلی میں آگ رکھنے کے مرادف ہو گیا ہے، آج ہواؤں میں خود معصیت ہے، ہواؤں سے معصیت پھیل رہی ہے۔

اس وقت ساری دنیا کا رجحان اور بعض دنیا میں کھل کر اور بعض دنیا میں اندرونی اعتبار سے یہ احوال ہو رہے ہیں کہ دین سے بے اعتنائی کی ہوا تیزی سے چل رہی ہے، اس وقت ہم جس دنیا میں قدم رکھنے والے ہیں وہ ایسا ہے کہ آنے والا زمانہ پچھلے زمانہ سے بہت سخت ہے، اس وقت کے لیے ہم اتنی محنت کر لیں، نمازوں سے بھر لیں، عبادت، تلاوت، ذکر وغیرہ سے بھریں، اور خوب بھر کر لے جائیں تاکہ پورے سال بلکہ پوری زندگی تک راسخ ہو جائے، اس کی محنت کر لیں، یہاں اللہ کے بہت بڑے بندہ کے سایہ عاطفت میں رہنے کی توفیق ہوئی ہے جہاں ہر وقت قال اللہ اور قال الرسول کی آواز ہوتی ہے، اور اس طرح ذکر ہوتا ہے جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہوں، ایسے ماحول میں خوب محنت کریں۔

بہت کم ہوں گے جو آدھا قرآن پڑھتے ہوں گے، بلکہ اس سے زیادہ ہی یہاں پڑھنے والے ہوں گے، ایسے ماحول میں اگر محنت کر کے ہم ایک جذبہ اور نورانیت اور بیٹری کا پاور لے کر یہاں سے گئے تو خود بھی ہم بڑے ماحول میں حفاظت سے رہ سکیں گے بلکہ اتنی محنت کر کے جائیں گے کہ پورا ماحول ہم سے نفع حاصل کرنے والا بنے۔

ایک تجربہ کی بات

ایک بات تجربہ کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر رمضان جمعیت خاطر کے ساتھ گزر گیا تو سارا سال جمعیت خاطر کے ساتھ گزرتا ہے، زاد المعاد میں بھی لکھا ہے کہ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے جو اوپر کہی گئی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ جمعہ میزان ہے ہفتہ کا، اور رمضان میزان ہے سال کا، اور حج میزان ہے پورے عمر کا، جس کا جمعہ اچھا گزرا اس کا پورا ہفتہ اچھا گزرے گا، جس کا رمضان اچھا گزرا اس کا پورا سال اچھا گزرے گا، اور جس کا حج اور اس کے ارکان اچھی طرح گزرے اس کی عمر اچھی طرح گزرے گی، اگر ہم نے ان اوقات کے اندر صحیح محنت کر لی تو ہم دوسروں کو بھی متاثر کر سکیں گے اور آنے والے ان حالات میں جو ہندوستان میں اور ہمارے علاقہ میں شدت سے پیش آنے والے ہیں اس میں بھی ہم جم سکیں گے۔

مقابلہ کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سے انتظام ہو، اس کے لیے ہتھیار ہوں اور وہ مضبوط ہوں، ہاتھ ہوں اور وہ مضبوط بھی ہوں، ورنہ اگر ہاتھ کمزور ہوں یا ہتھیار کمزور ہوں تو مقابلہ کے وقت وہ کیا کام دے سکے گا، تو ہتھیار بھی ہوں اور اچھے ہتھیار ہوں، اور ہاتھ بھی مضبوط ہوں اور جگہ بھی صحیح ہو، تب ہتھیار صحیح کام کر سکتے ہیں، تو اگر ہم یہاں محنت صحیح کریں گے تو وہ ناموافق حالات میں کام کرے گی، بے شک نماز فحشاء سے روکنے والی ہے اور تمام لازم اور متعدی خاصیت کی حامل ہے، لیکن وہ صلاۃ {هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ} نہ ہو۔

اور روزہ یقیناً ڈھال ہے، لیکن جب تک اس کے اندر سوراخ نہ ہو، سوراخ والی ڈھال ہرگز کام نہیں دے سکتی ہے، تو محنت کر کے عبادت کے لازمی اور متعدی پہلو ہم حاصل کرنے والے بنیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

قرآن مجید کا مقام اور اس کا پیغام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

قرآن مجید سے تعلق ہونا ایک نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے فائدہ اٹھانا سعادت کی بات ہے، اس لیے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، اور براہ راست اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے، اس کی طاقت، اس کی خصوصیت، اس کا اثر بے انتہا ہے، اس کا اثر ایسا ہے کہ اگر یہ اپنے صحیح اثر کے ساتھ اس دنیا میں ظاہر ہو جائے تو دنیا اس کو برداشت نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو کئی مثالوں سے بتایا، ایک جگہ فرمایا کہ اگر ہم نے اس کلام کو پہاڑوں پر نازل کیا ہوتا تو پہاڑ اس کو اٹھا نہیں سکتے تھے، بلکہ وہ پھٹ جاتے، جل جاتے، اسی لیے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال بھی پیش کی گئی کہ انہوں نے تجلی کی درخواست کی کہ "اے پروردگار! ہم آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں"، تو ارشاد ہوا: "ہماری تجلی کو پہاڑ برداشت نہیں کر سکتا، اگر کرلے گا تو تم بھی دیکھ سکتے ہو"، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی ذرا سی تجلی ہوئی تو کوہ طور پہاڑ جل کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے اس کو کسی نے دبا دیا ہو، اور حضرت موسیٰ بھی بے ہوش ہو گئے، اور اس تجلی کو نہ دیکھ سکے، تو یہ کتاب (قرآن مجید) آسمانی کتاب ہے، اور یہ زمین آسمان نہیں ہے، زمین زمین ہے، آسمان آسمان ہے، اس لیے آسمان کو یہ زمین برداشت نہیں کر سکتی، آسمان کی جو طاقت اور وزن ہے اس کے سامنے یہ زمین کوئی حیثیت نہیں رکھتی، زمین کی حیثیت سورج کے سامنے کچھ نہیں ہے، سورج اتنے فاصلہ سے بھی زمین کو تپا دیتا ہے اور زمین اسی کے گرد گردش کر رہی ہے، وہ بھاگ نہیں پاتی، گویا اس اعتبار سے زمین کی کوئی حیثیت و حقیقت نہیں ہے، کیونکہ سورج سے بڑی چیز بھی آسمان کی طاقت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے غور کا مقام ہے کہ اللہ کا کلام جو ایک تجلی کی حیثیت رکھتا ہے اس زمین پر کیسے آسکتا ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر یہ کرم فرمایا کہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اپنے کلام کو زمین پر بھیجا اور وہ انتظامات فرما دیئے کہ جن کی وجہ سے یہ کلام زمین پر رہ سکے، اور لوگ اس کو پڑھ سکیں، ورنہ اگر یہ کلام اپنی اسی طاقت کے ساتھ ہو یعنی اسی کیفیت کے ساتھ ہو جو اس کی کیفیت ہے تو اس کو آدمی اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکے گا، اور اس کو سن نہیں سکے گا، کان برداشت نہیں کر سکیں گے، بلکہ اس کی تجلی اثر انداز ہوگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "اگر ہم اس کو پہاڑوں پر نازل کرتے تو پہاڑ پھٹ جاتے، لیکن انسان کے لیے ہم نے اس کو اتار دیا، تاکہ انسان اس سے فائدہ اٹھائیں"، اور انسان کے فائدے کے لیے اللہ نے اس چیز کو ایسا کر دیا کہ یہاں زمین پر رہ سکے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ ہوتا ہے جو تار سے گزرتا ہے اس کے اوپر ربڑ چڑھی ہوتی ہے اگر اس کو کوئی پکڑ لے، اس کو استعمال کرے، تو اس سے روشنی حاصل ہوگی، اس سے انجن چلایا جا سکتا ہے، لیکن اگر کوئی اسی کھلے تار کو چھو لے تو اس کے کرنٹ کے لگنے سے زندہ نہیں رہے گا، اور اگر انسان وہی کرنٹ بالواسطہ چھوتا ہے تو اس کو برداشت کر لیتا ہے، اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتا ہے، البتہ براہ راست اس کو نہ چھوا جا سکتا ہے، نہ ہلایا جا سکتا ہے، نہ ہی اس پر ہاتھ رکھا جا سکتا ہے، اسی طرح قرآن مجید کی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو ایسا غلاف روحانی عطا فرمایا کہ یہ ہمارے کانوں میں بھی جاتا ہے، ہمارے منہ سے بھی ادا ہوتا ہے، اس کو ہم کاغذ پر لے لیتے ہیں، اس کو اٹھاتے ہیں، ورنہ اگر یہ غلاف میں اس طرح نہ ہو جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے فائدہ کے لیے اس کو رکھا ہے، تو یہ کلام اس دنیا میں اتر نہیں سکتا، دنیا اس کو جھیل نہیں سکتی، بلکہ دنیا پھٹ جائے گی، ٹوٹ جائے گی، گویا یہ اللہ کا ایسا فضل ہے کہ وہ چیز جس کو ہم برداشت نہیں کر سکتے وہ ہم کو عطا فرمائی، جو چیز یہاں رہ نہیں سکتی تھی اللہ نے اس کو اتارا، تاکہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، تو اتنی بڑی دولت و نعمت اللہ نے ہم کو دی ہے جو ہم کو عام حالات سے نہیں مل سکتی تھی، لہٰذا اس کی قدر کرنے کی ضرورت ہے، انسان اس کی جتنی زیادہ قدر کرے وہ کم ہے۔

قرآن مجید کی قدر: قرآن مجید کی قدر یہ ہے کہ

{لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ} (شاید وہ سمجھ سکیں، غور کرسکیں)

یعنی بندے یہ سمجھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ کا مقام کیا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کی کیا حیثیت ہے، اور ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو توجہ دلاتا ہے کہ تمہیں کیسی زندگی گزارنی چاہیے؟ تمہارے کیسے اعمال ہونے چاہئیں؟ تمہارا کیا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟ تمہارے دل کے اندر کیا کیفیت ہونی چاہیے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بے شمار احسانات کئے ہیں، یہ دنیا ہمارے لیے بنائی، ہمارے لیے ہی سورج کو مسخر کیا، چاند کو ہمارے لیے مفید بنایا، اسی طرح زمین میں جو کچھ ہوتا ہے، اور جو کچھ پایا جاتا ہے وہ سب اللہ نے ہمارے فائدے کے لیے رکھا کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، غرض کہ ہر طرح کی نعمتیں جن کی ہم کو زندگی میں ضرورت ہے، وہ سب اللہ نے ہمارے لیے مہیا کیں، اسی لیے ان سب کو دینے کے بعد وہ چاہتا ہے کہ بندہ اس کی بات کو مانے اور اپنے پروردگار کے سامنے اپنے کو بندہ بنا کر رکھے، اپنے پروردگار کا مقابلہ نہ کرنے لگے، یعنی اپنے کو اپنے پروردگار کے برابر سمجھنے لگے، وہ اس طرح کہ اپنے نفس کے مطابق عمل کرے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کردے، یا جس طرح اپنے ساتھی کے ساتھ رویہ ہوتا ہے وہی رویہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختیار کرے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ جو کہہ رہا ہے وہ نہیں کرتا، یعنی اپنے کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھ رہا ہے، یا کسی اور کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھ رہا ہے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت ہی ناپسندیدہ ہے، کیونکہ خدا ہی نے اس کو سب کچھ عطا فرمایا، حتیٰ کہ زمین پر اپنا کلام اتار دیا جو کہ اتر نہیں سکتا تھا، لیکن اللہ نے اس کو اسی لیے اتارا تاکہ ہم اس سے صحیح راہ پر آسکیں، اس لیے اس کلام کی قیمت کو سمجھنا چاہیے اور اس کا جو ادب اور مقام ہے اس مقام کی قدردانی جیسی کرنی چاہیے وہ بھی ضروری ہے۔

آداب قرآنی: قرآن مجید کا پہلا ادب یہ ہے جس کو خود قرآن مجید ہی میں بیان فرمایا گیا: {لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ} (اس کو نہیں چھوتے مگر وہ لوگ جو پاکیزہ ہوتے ہیں)

یوں تو انسان مکمل طور پر پاک ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ نہ جانے اس کے پیٹ میں کیا کیا بھرا ہوا ہے، لیکن ظاہری طور پر اللہ نے ایسا طریقہ بتایا کہ اگر اس کو اختیار کرلیا جائے تو انسان کو پاک سمجھ لیا جائے گا، اب ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس پاکی کے طریقہ کو اختیار کرنے کے بعد اللہ کا پاک کلام پڑھے، اور اللہ کا یہ احسان سمجھے کہ اس نے اس قابل بنادیا کہ ایک ناپاک انسان اللہ کے پاک کلام سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس کی قدردانی میں بھی کوتاہی سے کام نہ لے، قرآن مجید کی قدر جتنی ہم کرسکتے ہیں ہمیں کرنی چاہیے اور اس میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے ہماری زندگی کی جو رہنمائی ہوتی ہے اس رہنمائی سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہیے، ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، کیونکہ اس کلام کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، اور اپنی زندگی کو اس سے سنواریں، جب ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق یہ بات ہوگی اور اللہ تعالیٰ کو پسند آئے گی کہ اس کا بندہ اس کی اطاعت کر رہا ہے، اس کے کہنے پر چل رہا ہے، اس نے جو ہدایات دی ہیں ان کو مان رہا ہے۔

نزول قرآن کا مقصد: اتنے واسطوں سے قرآن مجید کا نزول محض ہمارے فائدے کے لیے ہوا، تاکہ ہم اس سے نصیحت حاصل کریں، اپنی زندگی کو بنائیں اور سنواریں، اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالیں، احکامات الٰہیہ کے مطابق زندگی گذارنے سے ہم صحیح راستہ پر عمل کرنے والے ہوسکیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کو آسمانی طاقت حاصل ہوگی، جو کہ ہمیں آخرت کی زندگی میں کام دے گی، حدیث شریف میں آتا ہے ہمارا کوئی عمل ایسا ہے جس سے وہاں (جنت میں) باغ لگ جاتا ہے، ہمارا کوئی عمل ایسا ہے کہ جس سے نہریں جاری ہوجاتی ہیں، ہمارا کوئی عمل ایسا ہے کہ جس سے ہمارے لیے قصر (محل) تیار ہوجاتا ہے، ظاہر ہے ہمیں وہاں اس طرح کی جو بھی چیزیں ملیں گی وہ ہمارے اس عمل کی وجہ سے ملیں گی، جو ہم یہاں زندگی میں کرتے ہیں، اور وہ کون سا عمل ہے جس سے وہاں ہمیں یہ چیزیں ملیں گی؟ اس سے مراد وہی عمل ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے فائدے کے لیے اپنے نبیوں اور اپنے کلام کے ذریعہ سے ہم کو بتادیا کہ تم یہ کروگے تو تم کو یہ فائدہ ہوگا، اور اگر تم نہیں کروگے تو جب وہاں (آخرت میں) جاؤ گے تو تمہیں چٹیل میدان ملے گا، جہاں نہ سایہ ہوگا، نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے تم فائدہ اٹھا سکتے ہو، جیسے پتھر ہوتا ہے اس پر آپ کھڑے

رہیے تو آپ کو نہ سایہ حاصل ہوگا، نہ ہی آپ کو راحت ملے گی، اسی طرح وہاں کا نظام بھی مٹی والا نظام نہیں ہے، بلکہ وہاں کا نظام روحانی ہے جو ہمارے عمل کے نتیجہ میں ظاہر ہوگا، اس دنیا میں ہم جیسا عمل کریں گے، وہاں ویسا ہی عمل ظاہر ہوگا، یہ تمام وہ تعلیمات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعہ سے انسانوں کو بتائی ہیں۔

حکمت الٰہی: حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام نازل فرمایا، اور اس کی حکمت یہ بیان کی گئی کہ اس سے لوگ نصیحت حاصل کریں، غور کریں، اور سمجھیں کہ ان کی کیا ذمہ داری ہے، اور اس دنیا میں ان کو کس طرح رہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے جو مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، ان کی نوعیتیں الگ الگ ہیں، ان سب کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت رکھی ہے ان میں وہی صلاحیت موجود ہے، وہ اس سے ہٹ نہیں پاتے، دوسری بات یہ ہے کہ ان کو مزید کسی بارے میں معلومات بھی نہیں ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر معلومات نہ ہوں تو انسان بھی بالکل بے کار ہوتا ہے، مثلاً: اگر آپ کو نہ معلوم ہو کہ کپڑا کیسے بنتا ہے؟ کپڑا کہاں سے لایا جاتا ہے؟ غذا کہاں ملے گی؟ کیسے ملے گی؟ پانی کیسے حاصل ہوگا؟ اگر یہ چیزیں آپ کو معلوم نہ ہوں یا آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں کہ وہاں پانی نہ ہو، غذا کا بھی کوئی انتظام نہ ہو، وہاں کی زمین ہی ایسی ہو کہ وہاں کچھ نہ ملتا ہو اور آپ کو کچھ معلوم بھی نہ ہو تو آپ کہاں سے کھانا لائیں گے؟ کہاں سے پانی لائیں گے؟ کہاں سے کپڑے لائیں گے؟ ایسے موقع پر آپ کچھ نہیں لاسکتے، معلوم ہوا انسان کی زندگی کا پورا نظام معلومات پر چل رہا ہے، معلومات کے ذریعہ سے آدمی اپنی ضروریات اور اپنے تقاضے اور اپنا مقصد سمجھتا ہے، اپنے مقصد کو بھی معلومات کے ذریعہ سے سمجھتا ہے، گویا معلومات بنیادی چیز ہے جس سے انسان اس دنیا میں زندہ ہے، ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ ہوتا، ایک بیل ہے اس کو کھانے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرنا نہیں پڑتا، اور نہ ہی کوئی ذریعہ اختیار کرنا اس کے بس میں ہے، کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا، وہ تو جہاں دیکھے گا کھالے گا، کسی زمین میں پانی دیکھے گا تو پی لے گا، اس کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ پانی کیسے ملتا ہے؟ پتے کیسے حاصل ہوتے ہیں؟ گھاس کیسے پیدا ہوتی ہے اور کہاں پیدا ہوتی ہے؟ اسی طرح دیگر مخلوقات کا بھی یہی معاملہ ہے، فرشتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو تابعدار بنایا ہے، وہ اپنی رائے سے کچھ نہیں کرسکتے، اپنے خیال سے کچھ نہیں کرسکتے، ان کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے، جو کام ان کے سپرد ہے، وہ صرف وہی کام کرسکتے ہیں، لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں علم کے ذریعہ سے ممتاز بنایا ہے، انسان کو زندگی کی معلومات عطا فرمائیں، اور زندگی کے ساتھ بعد والی زندگی جو آنے والی ہے اس کی معلومات بھی عطا فرمائیں کہ یہ معلومات جو دنیا کی ہیں ان سے اپنی زندگی کی ضروریات پوری ہوں گی، کہاں سے پانی لایا جائے؟ کہاں سے غذا حاصل ہو؟ کہاں سے کپڑا لایا جائے؟ کہاں سے مکان بنایا جائے؟ ان ضرورتوں کو دنیوی معلومات سے پورا کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی، اور جو دین (آخرت) کی معلومات ہیں، ان سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو سنوارے، اپنے خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، تاکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوازا جائے اور وہاں کی ساری سہولتیں مہیا ہوسکیں، جس کی ضرورت ہمیں دوسری زندگی میں ہوگی، وہاں اس طرح نہیں ہوگا کہ آپ کھیتی باڑی کریں اور غلہ اگائیں یا درخت لگائیں اور باغات پیدا کریں، وہاں کچھ نہیں ہوگا، وہاں اللہ تعالیٰ نے دوسرا نظام رکھا ہے، وہ آسمانی نظام ہے، اس دنیا کی طرح مادی اور مٹی والا نظام نہیں ہے، ہماری زندگی میں ہماری ساری ضروریات مٹی سے پوری ہوتی ہیں، مٹی ہی سے غلہ پیدا ہوتا ہے، مٹی ہی سے درخت پیدا ہوتے ہیں، مٹی ہی سے لوہا نکلتا ہے، تانبا نکلتا ہے، اور دوسری دھاتیں نکلتی ہیں، مٹی ہی سے پٹرول نکلتا ہے، مٹی ہی سے تیل نکلتا ہے، پانی نکلتا ہے، غرض کہ ہماری ضرورت کی تمام چیزیں اس حقیر مٹی سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن جو آسمان کا نظام ہے وہ مٹی والا نظام نہیں ہے، وہ روحانی نظام ہے، معنوی نظام ہے، وہاں آدمی کے عمل کی بنیاد پر چیزیں حاصل ہوں گی، خواہ ہم جو بھی عمل کرتے ہوں، صحیح راستہ پر چلنے کا عمل، معقول طریقہ اختیار کرنے کا عمل، جس کو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ سے ہم کو بتایا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہم کو نہیں بتاتا، کیونکہ ہماری طاقت اس کو برداشت نہیں کرسکتی، خود حضور ﷺ کا یہ حال ہوتا تھا جب کہ آپ کو اللہ نے ہر حیثیت سے مکمل بنایا تھا، تب آپ کا یہ حال ہوتا تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تھی.....(باقی صفحہ نمبر ۶ پر)

آئینۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو ایک ایسا قائد اور ایک ایسا رہنما عطا فرمایا، جس کی مثل نہ کوئی پہلے ہوا اور نہ بعد میں ہوگا، رسول پاک علیہ الصلوۃ والسلام جو ساری انسانیت کے امام اور قائد ہیں، ان کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا:

{لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا} (الاحزاب:۲۱) (یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں بہترین نمونہ موجود ہے اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہو اور اس نے اللہ کو بہت یاد کیا ہو)

حضور ﷺ کی ذات والا صفات میں اسوۂ حسنہ رکھا گیا ہے، لیکن کس کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو، ایسے شخص کے لیے رسول پاک ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ ہے، آپ ﷺ نے ساری انسانیت کو اپنی زندگی نمونہ کے طور پر پیش فرمائی، لہٰذا ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس آئینہ میں دیکھ لے، اگر آپ ﷺ کے آئینہ میں وہ شخص صحیح ہے تو پھر صحیح ہے اور اگر غلط ہے تو غلط ہے، جس کو فوری طور پر صحیح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں کوئی چیز تشنہ نہیں چھوڑی ہے کہ آدمی کسی دوسری جگہ نمونہ تلاش کرے، آپ ﷺ نے ہر چیز مکمل طور پر پیش فرمادی ہے، اب یہ ہمارے اور آپ کی بات ہے کہ ہم اس کو کتنا تلاش کرتے ہیں، ظاہر ہے ہر چیز تلاش سے ملتی ہے، جو محنت کرتا ہے، جدوجہد کرتا ہے اسی کو پھل ملتا ہے، جو محنت کرے گا اور کوشش کرے گا وہی اس کا صلہ پائے گا، اور جو محنت نہیں کرے گا، کوشش نہیں کرے گا اس کو گھر بیٹھے کچھ نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قیامت تک کے لیے تمام انسانیت کا نمونہ بنادیا، اب ہم کو اور آپ کو دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اندر کیا کمی ہے؟ ہمیں اپنی ذات کو حیات نبوی ﷺ کا آئینہ سامنے رکھ کر درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، ظاہر ہے کمیاں ہر انسان کے اندر بہت ہیں اور انہیں کے ازالہ کے لیے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات دنیا کے اندر آتے تھے۔

انسانی سماج کی اصلاح میں انبیاء کا پہلا کام "دعوت الی التوحید" تھا، وہ لوگوں کو عقیدۂ توحید کی طرف بلاتے تھے کہ اس کے بغیر نجات ہی ممکن نہیں، اور نمبر دو پر جس علاقہ میں جس قوم میں جو کمی ہوتی تھی وہ بتاتے تھے، یہ ایک لازمی بات تھی، اگر ہم قرآن مجید میں حضرت ھود، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب، حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے تذکرے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ قرآن ان کے تذکرہ کے ساتھ ان کی قوم کی بیماری بھی بتاتا ہے، جس کا انبیاء نے علاج کیا، گویا نبی کا ایک کام یہ ہوتا تھا کہ وہ توحید بتاتے تھے، دوسرا کام یہ ہوتا تھا کہ قوم میں جو بیماری ہوتی تھی، اس کی اصلاح کرتے تھے، اور ان کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اس کام پر کوئی اجرت نہیں لیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہماری اجرت اللہ کے یہاں ہے۔ اس کے علاوہ وہ دو باتیں اپنی قوم سے مزید کہتے تھے، پہلی یہ کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہارا بھلا چاہنے والا ہوں، اور دوسری یہ کہ میں امانت دار ہوں، ظاہر ہے جب کسی کا بھلا چاہیں گے تو اس کو صحیح بات بتائیں گے اور جب امانت دار ہوں گے تو بات بھی صحیح پہنچائیں گے۔ اب اگر یہی تمام صفات امت محمدیہ کے کسی فرد میں ہوں تو وہ شخص صحیح معنی میں نبی کا جانشین بنتا ہے، اور اگر ان صفات میں کمی ہے تو وہ اتنا ہی ناقص جانشین سمجھا جائے گا۔

انبیاء کی زندگیاں اور بالخصوص نبی اکرم ﷺ کی زندگی ہر فرد بشر کے لیے آئینہ کی حیثیت رکھتی ہے، آپ ﷺ علماء کے لیے آئینہ ہیں، عوام کے لیے آئینہ ہیں، مزدور طبقہ کے لیے آئینہ ہیں، کارخانوں کے مالکوں کے لیے آئینہ ہیں، شوہروں کے لیے آئینہ ہیں، غلاموں کے لیے آئینہ ہیں، پڑھے لکھوں کے لیے آئینہ ہیں، ان پڑھوں کے لیے آئینہ ہیں، مزدور پیشہ لوگوں کے لیے آئینہ ہیں، غرض کہ ہر ایک کے لیے آپ نے ایک نمونہ رکھا ہے، اور آپ ﷺ نے بذات خود سارے کام کیے بھی ہیں، آپ ﷺ نے تجارت بھی کی ہے، لہٰذا آپ تاجر پیشہ لوگوں کے لیے بھی نمونہ ہیں، اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے زریں اصول بھی دیئے ہیں، جو تمام انسانیت کے لیے نمونہ ہیں، آپ ﷺ نے یہ بھی سکھایا کہ وقت کیسے گذارا جائے،

آپ ﷺ نے یہ بھی بیان کیا کہ کس طرح وقت کی قدر کرنی چاہیے، اور وقت کو پہچاننا چاہیے۔ غرض کہ رسول پاک ﷺ کی ذات ہر اعتبار سے سب کے لیے آئینہ ہے۔

انسانی زندگی کو سنوارنے کا دوسرا بہترین آئینہ قرآن مجید ہے، ارشاد الٰہی ہے: {فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ} (الأنبیاء:۱۰) (اس میں (قرآن مجید میں) تمہارا تذکرہ ہے، بھلا تم غور نہیں کرتے کہ تمہارا تذکرہ کیا ہے)

موجودہ دور میں دیکھا جائے تو ہم لوگ من مانی سے کام لیتے ہیں، ہمارے جو جی میں آتا ہے ہم وہی کرتے ہیں، اور ہم یہ نہیں دیکھتے کہ قرآن کریم کا مقصود کیا ہے؟ اور رسول پاک ﷺ کا اسوہ کیا بیان کر رہا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے اندر کمی پر کمی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے، جیسے کسی کے منھ پر سیاہ داغ پڑ جائے اور وہ شخص کبھی آئینہ نہ دیکھے اور اس کے چہرہ پر کالا پن بڑھتا جائے، تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ داغ بڑھتا جائے گا اور وہ سراپا داغ دار ہو جائے گا، ٹھیک اسی طرح آج ہماری سیرت پر بھی کالا دھبہ لگ گیا ہے، اور چونکہ ہم نے قرآن مجید اور اسوۂ نبوی کا آئینہ دیکھنا بند کر دیا ہے، اس لیے ہماری سیرت سراپا داغ دار ہوتی جا رہی ہے۔

حقیقی معنی میں اگر کوئی شخص قرآن وحدیث پر عمل کرنے والا ہو تو اس کی ذات خود آئینہ بن سکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں بھی آتا ہے: مؤمن مؤمن کے لیے آئینہ ہے۔ آئینہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ اصلاح کا قائل ہے، آج تک آپ نے یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی آئینہ نے چلا کر کہا ہو کہ تم غلط ہو، آپ جب آئینہ دیکھیں گے تو آپ کو خود ہی اپنا داغ نظر آجائے گا، آئینہ میں داغ دیکھنے والا خود سمجھ جاتا ہے کہ مجھ سے آئینہ کہہ رہا ہے کہ تم اپنے اس داغ کو دھولو، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو حقیقی خیر خواہ ہوتا ہے وہ اسی طرح اپنے قریبی کو بچاتا بھی ہے، آپ نے دیکھا ہوگا جو لوگ ایک دسترخوان پر ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، اور اگر کسی کی ڈاڑھی پر دال یا چاول لگ جاتا ہے تو سمجھ دار انسان کبھی چلا کر نہیں کہتا کہ اسے صاف کرلو، بلکہ اشارہ کرتا ہے کہ اسے ٹھیک کرلو، ورنہ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، غرض کہ آئینہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ حدیث پاک میں اسی لیے کہا گیا ہے کہ مؤمن مؤمن کے لیے آئینہ ہے، یعنی ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن کے لیے آئینہ کی طرح ہونا چاہیے، دوسرے اپنا چہرہ ہم میں دیکھ کر اپنی اصلاح کر سکیں، لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو قرآن مجید اور حضور اکرم ﷺ کے آئینہ میں سنواریں۔

آئینہ ہر آدمی نہیں بن پاتا، آئینہ وہ بن پاتا ہے جو قرآن مجید کے اسوہ میں اپنے کو سنوارے اور حضور ﷺ کے نمونہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھے کہ آپ نے کیا بتایا ہے، آپ نے کیا عمل کیا ہے، آپ نے کیا سمجھایا ہے، جب ہم یہ دیکھیں گے تو ہم آئینہ بن جائیں گے، اور جب ہم آئینہ بن جائیں گے تو پھر کیا کہنے! ہم خود تو صاف شفاف ہوں گے ہی اور پھر دوسرے بھی ہمیں دیکھ کر اپنے آپ کو ٹھیک کرلیں گے۔ آئینہ کو داغدار نہیں ہونا چاہیے، ورنہ دوسرا اس میں خود کو صحیح سے دیکھ ہی نہیں سکتا اور اصلاح بھی نہیں لے سکتا، اسی لیے مؤمن کو کہا گیا کہ آئینہ بنو، یعنی اپنی سیرت کے سارے داغ صاف کرلو اور اس طرح چمکنے لگو کہ دوسرا اپنا چہرہ آپ کے اندر دیکھ لے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود کو قرآن مجید میں دیکھ کر درست کریں، اور ہمارے سامنے رسول ﷺ کی حیات طیبہ موجود ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں آپ ﷺ کا نمونہ موجود ہے، اور اس سلسلہ میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نہیں جانتے ہیں، آپ کا چلنا پھرنا سونا جاگنا، آپ کا ازواج مطہرات کے ساتھ معاملات کرنا، آپ کا لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، آپ کا بڑوں سے اچھا معاملہ کرنا، آپ کا غیروں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا، ہر چیز بالکل عیاں ہے، اور عیاں بھی ایسی بیاں ہے کہ بالکل چمکتی دمکتی ہے۔ اگر اس کی روشنی میں ہم اپنا جائزہ لیں تو ہمیں صاف نظر آجائے گا کہ ہم لوگ عیب والے ہیں۔ ایک بات یاد رکھنے کی یہ بھی ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کے عیب کو دور کریں تو ہم وہی انداز اختیار کریں جو رسول ﷺ نے تلقین فرمایا ہے، آپ ﷺ جب لوگوں کی اصلاح کا ارادہ فرماتے تھے تو ایسی کوئی بات نہیں کہتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو، بلکہ یوں مخاطب ہوتے تھے کہ ”ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے، یہ ایسا کر رہے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ یعنی آپ ﷺ اچھے اور عمدہ انداز سے تلقین فرماتے تھے، افسوس کہ ہم لوگوں نے اس آئینہ کو دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔

دین کے قلعے کی فصیلوں کو مضبوط کرو

مولانا عزیز الحسن صدیقی

جس طرح پرانے زمانہ میں بادشاہ اور نوابین اپنی حکومت اور ریاست کی حفاظت کی خاطر گڑھیاں اور قلعے تعمیر کراتے تھے، علماء دین کے تحفظ واشاعت کی غرض سے مدرسے قائم کرتے تھے، حکومتوں اور ریاستوں نے بھی مدارس قائم کیے، لیکن جب ان کا اقتدار ختم ہوا تو ان کے مدرسے بھی ختم ہو گئے، جب کہ علماء کے قائم کردہ مدرسے جو عوامی چندوں سے چلتے تھے، بدستور خدمت انجام دیتے رہے، ایسے مدارس انگریزوں کے زمانے میں بھی تھے اور آج بھی ملک کے کونے کونے میں ہیں، پہلے حکومتیں مدارس کے نصاب و نظام میں دخل اندازی نہیں کرتی تھیں، لیکن ملک کی آزادی کے بعد مدارس کے معاملات میں برابر مداخلت کی جارہی ہے، جب ۱۹۵۰ء میں سیکولر دستور نافذ ہوا تو سمجھا گیا کہ اب حکومت دستور کی رو سے اسکولوں میں کسی خاص مذہب کی تعلیم نہیں دے گی، مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیم کے لیے خود مدارس قائم کرنے ہوں گے، اس بناء پر ملک بھر میں ہزاروں مدارس و مکاتب قائم کیے گئے لیکن آزادی کے بعد سے حکومت کی طرف سے مسلسل مدارس پر طرح طرح کی قدغنیں لگائی جاتی رہی ہیں، پہلے انہیں دہشت گردی کے اڈے کہا گیا اور اب ان پر داد و دہش کی بارش ہو رہی ہے، مگر اس کی قیمت بھی پوری وصول کی جارہی ہے، تجدید کاری کے نام پر ان کے نصاب و نظام کو بدلنے کی کوشش کی جارہی ہے، دوسری طرف سرکاری اسکولوں میں ایک خاص مذہب کی تعلیم دی جارہی ہے، نصابی کتابوں کو تبدیل کیا جارہا ہے اور ایسے مضامین نصاب تعلیم میں شامل کیے جارہے ہیں، جن کو پڑھ کر بچے اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔

ایسے حالات میں ہمارا فریضہ ہونا چاہیے تھا کہ ایسے اسکول قائم کرتے جن میں عصری تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم بھی دی جاتی لیکن افسوس کہ ہم غفلت کی نیند سو رہے ہیں، یہ بھی کم افسوس ناک بات نہیں ہے کہ مدرسوں سے مسلمانوں کی دوری بڑھتی جارہی ہے، سچر کمیٹی کے بقول چار فی صد بچے مدرسوں میں پڑھتے ہیں جب کہ اہل مدارس کہتے ہیں کہ محض ڈھائی فیصد پڑھتے ہیں، غور کرنے کا مقام ہے کہ ساڑے ستانوے فیصد بچوں کا تعلیمی مستقبل کیا ہوگا، وہ اپنے دین کی تعلیم کب اور کہاں حاصل کریں گے اور کس طرح اپنے ایمان کی حفاظت کریں گے، یاد رکھیے صرف مدرسوں کی مالی اعانت کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ان کو آباد کرنا بھی ضروری ہے۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مدرسوں کو بے وقت کی راگنی اور ترقی کی راہ کا روڑا سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ مدرسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دینی چاہیے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدرسہ اپنا کام چھوڑ کر سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے لگیں گے تو دین کی تعلیم کیا اسکولوں اور کالجوں میں ہوگی؟ انہیں کس نے روکا ہے کہ معیاری عصری درس گاہیں قائم نہ کریں، وہ شوق سے کالج میں پڑھیں پڑھائیں اور مدرسوں کے حال پر رحم کریں، مدرسے جو کام کر رہے ہیں ان کو کرنے دیں، ان کے آڑے نہ آئیں۔

یہ ٹوٹے پھوٹے مدرسے نہ ہوتے تو ملک میں موجود لاکھوں مساجد کو امام بھی نہ ملتے، کوئی دینی مسائل حل کرنے والا بھی نہ ملتا، نماز جنازہ کے بغیر مسلمان دفنائے جاتے، حرام و حلال کی تمیز اٹھ جاتی، اسلام سے وابستگی بس نام برابر اور رسموں کی حد تک باقی رہ جاتی۔

علمائے حق ہی تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی عیسائیت کا مقالہ کیا اور پادریوں کو دندان شکن جواب دیا اور اس کے بعد بھی ان کا تعاقب کیا، انہوں نے انگریزوں سے باقاعدہ میدان جنگ میں مقابلہ کیا لیکن جب ناکام ہو گئے تو حکمت عملی تبدیل کر دی اور جگہ جگہ مدرسے قائم کرنے شروع کر دیے، یہ مدرسے

جنگ آزادی کی چھاؤنی بھی تھے اور شرک و الحاد کے خلاف منظم محاذ بھی، انہیں مدارس نے قرآن وسنت کی تعلیم دے کر کفر وشرک کی تیز آندھیوں میں ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا ورنہ روس کی مسلم ریاستوں جیسا حال ہوتا، اذان پر پابندی لگادی جاتی، قرآن کی تلاوت ممنوع ہوتی، مساجد کو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا جاتا، علماء حق جنہوں نے تقسیم کی مخالفت کی تھی، حامیان تقسیم کے نزدیک قابل تعذیب تھے، مخالفین نے انہیں ستانے اور ایذا پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور انہیں بلا جھجک کافر گردانتے تھے، لیکن وہی کافر موت کے ڈر سے اندھے کنوئیں میں گرنے جارہے تھے گم کردہ راہ مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ کہاں جا رہے ہو، کیا وہاں کا خدا کوئی اور ہے؟ رکو، ٹھہرو، اپنے وطن میں جم جاؤ، دوسری طرف وہی کافر معابد و مقابر اور مآثر کی حفاظت بھی کر رہے تھے اور ان کے ایمان کو بچانے کی فکر بھی کر رہے تھے اور مدارس کی شکل میں دین کے قلعے تعمیر کر رہے تھے، آج انہیں قلعوں کی دیواروں میں دراڑیں ڈالی جارہی ہیں، ان کو مضبوط کرو، ان کی مضبوطی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے جگر گوشوں کو ان کے اندر کچھ دنوں کے لیے ڈال دو پھر دیکھو کہ وہ کس قدر تمہارے کام آتے ہیں۔

دینی مدارس کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ دین وملت کی بقاء اور ایمان کی سلامتی کے لیے کتنے مفید و کارگر ہیں، بقول حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی "روسی مسلمانوں کو اسلام کی طرف واپس لانے میں ماضی کے دینی مدارس نے اہم رول ادا کیا تھا، وہاں کے مسلمانوں نے دینی تعلیم کے مدارس و مراکز کے قیام پر پوری توجہ صرف کی تھی۔"

وطن عزیز میں مدارس کے ساتھ چند سال پہلے جو ناروا سلوک کیا گیا تھا، اس کو اپنے مقصد کے لیے معاندین نے مفید نہیں پایا، اس لیے داد و دہش کا سلسلہ شروع کیا، اس کے خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوئے اور مسلمان ان کے بچھائے جال میں پھنستے چلے گئے، اگر وہ اپنی خیر چاہتے ہیں تو خالص دین کی تعلیم دینے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے مدرسے قائم کریں، مدرسوں کو انڈسٹری نہ بنائیں، فاقہ کرنا پڑے تب بھی حق کی راہ نہ چھوڑیں، مسلمان ہی تو پیسے کو ہاتھ کا میل کہتے ہیں پھر کیوں میل کی طرف ان کا میلان ہے؟ ہمارے وطنی بھائی اس کی پوجا کرتے ہیں، ہم تو نہیں کرتے پھر کیوں رشوتوں کی گرم بازاری اور لین دین جاری ہے؟

ترکی کو اسلام کی طرف لوٹانے میں ترکی کے "درسانوں" (دینی درس گاہوں) نے اہم پارٹ ادا کیا تھا، پس اے مسلمانو! دین کو مضبوطی سے تھام لو اور فی زمانہ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ دینی مدرسوں کا ہاتھ مضبوط کرو اور سب سے پہلے انہیں میں اپنی اولاد کو دین سیکھنے اور قرآن پڑھنے کے لیے بھیجو اور اگر تم نے کوتاہی کی تو یاد رکھو تمہارا حشر اسپین کے مسلمانوں جیسا ہو کر رہے گا، جنہوں نے اپنے ۸ سو سالہ دور اقتدار میں بلند و بالا عمارتیں اور مجسمے کھڑے کیے، مغرب کو سائنس، صنعت اور طب کی تعلیم دی، بلاشبہ مساجد بھی تعمیر کیں لیکن دین کی خدمت جیسی کرنی چاہیے تھی نہیں کی اور جبر الٹر کے ہیرو طارق بن زیاد کے کردار کو بھلا بیٹھے، ۱۴۹۲ء میں اسپین سے مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد بہت سے مسلمان اپنا ایمان بچا کر افریقہ کے ملکوں کی طرف ہجرت کر گئے، اور جو نہ جاسکے وہ ایمان کھو بیٹھے اور ان کی نسلیں اسلام سے پھر گئیں، تم اپنی اولاد اور اپنے آنے والی نسلوں کے ایمان کی حفاظت کے لیے دین کے قلعوں یعنی مدرسوں سے لپٹ جاؤ، ان کی حفاظت کرو تمہاری حفاظت از خود ہو جائے گی، وطن عزیز کو مسلمانوں کے حق میں اسپین بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان حقائق سے آنکھیں چرا کر "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے فارمولے پر عمل کر رہا ہے، کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں ہے، شادی کی تقریب کو شاہی تقریب بنا رہا ہے، سادگی سے اس کو پرہیز ہے، فضول خرچی پسند ہے، وقتی خوشی حاصل کرنے کے لیے قرض لینے سے بھی نہیں چوکتا، مستقبل تابناک ہو، عاقبت بخیر ہو، اس کی طرف مطلق توجہ نہیں دیتا، خدا کرے ہماری تند و تلخ باتیں اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ سکیں اور وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہو اور کچھ کر گزرے، بلاشبہ راہیں پر خار و پر خطر ہیں لیکن عزم سفر کے سامنے سب ہیچ ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ

ایثار و مواسات کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مہمانِ رسول کی ضیافت:

ایک مرتبہ رسول ﷺ کے پاس ایک بہت پریشاں حال شخص آیا، اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت دکھی ہے، اور اس کے پاس کچھ اسباب نہیں ہیں جن سے وہ اپنا کام چلائے، اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے یہ کہا بھی کہ میں بہت پریشاں حال ہوں، ظاہر ہے آپ ﷺ سے بس اتنا ہی کہنا کافی تھا، آپ ﷺ نے فوراً اپنے کسی گھر میں کہلوایا کہ اگر کھانے کو کچھ ہو تو بھجواؤ، لیکن آپ ﷺ نے اپنے جس گھر میں بھی آدمی بھیجا وہاں سے ایک ہی جواب آیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ (ﷺ) کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، گھر میں سوائے پانی کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ قصہ مکہ مکرمہ کا نہیں، مدینہ منورہ کا ہے، اور یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب خزانے آپ ﷺ کے قدموں میں آرہے تھے، اور فتوحات کا دور شروع ہو چکا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک سیل رواں تھا جو ادھر سے آرہا تھا اور ادھر جارہا تھا، گھر میں کچھ باقی نہیں رہتا تھا، چنانچہ تمام ازواج مطہرات نے معذرت کی کہ سوائے پانی کے کچھ نہیں ہے۔

صحابی کا عمل اور قرآنی بشارت:

اس معذرت کے بعد آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: یہ ایک مہمان ہے، آج رات کون اس کی ضیافت کرے گا، یہ بے چارہ ضرورت مند ہے، اس کو کوئی شخص اپنے گھر لے جائے اور اس کی ضیافت کردے، اس کو کھلا پلادے۔ چنانچہ ایک انصاری صحابی کھڑے ہوئے، اور انہوں نے کہا: اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں، موقع عنایت فرمائیے، اللہ کے رسول ﷺ نے اجازت دے دی، اور وہ صحابی ان کو اپنی قیام گاہ پر لے آئے اور بیوی سے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے مہمان ہیں، آج رات ہمیں ان کی ضیافت کرنی ہے، کیا گھر میں کچھ ہے؟ بیوی کہنے لگیں کہ بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا رکھا ہے، اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے، صحابی نے کہا: بچوں کو بہلا پھسلا کر سلادو، اور جب ہم لوگ رات کو کھانا کھانے کے لیے بیٹھیں تو اندھیرا ہوگا، لہٰذا ہم چراغ بجھادیں گے، اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہم کھانا کھا رہے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، چراغ گل کردیا گیا اور مہمان کھاتا رہا، اور ان دونوں کا ہاتھ پلیٹ کی طرف جارہا تھا اور منھ کی طرف جارہا تھا، نہ ہاتھ میں کچھ تھا نہ منھ میں کچھ، اور ان دونوں نے اسی بھوک کے حال میں پوری رات بسر کی۔ پھر جب صبح اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو تمہارا یہ عمل بہت پسند آیا ہے، اور یہ آیت نازل ہوئی ہے:

{وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ} (الحشر: ۹) (اور وہ (دوسروں کو) اپنی جانوں پر مقدم رکھتے ہیں خواہ خود تنگدستی کا شکار ہوں)

انتہائی ایثار:

اس حدیث میں یہ واقعہ بھی خاص طور پر پیش نظر رہے، جو کہ بہت آگے کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کو بھوکا سلادیا، ایک باپ کو اپنے بچوں سے طبعی طور پر پیار ہوتا ہے، اور پھر ماں تو کسی صورت راضی ہی نہ ہوتی، وہ کہتی یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں کیسے اپنے بچوں کو بھوکا سلادوں، یہ بہت مشکل ہے، لیکن چونکہ مہمان اللہ کے رسول ﷺ کے تھے، لہٰذا نہ جانے انہوں نے اپنے بچوں کو کس طرح بھوکا سلایا ہوگا، بچے بھوک کے مارے بے چارے پریشان ہوں گے، البتہ یہ انتہائی درجہ کی قربانی ہے کہ مہمان کو کھلادیا، اور خود بھوکے رہے اور بچے بھی رات میں بھوکے سوئے۔

صحابہ کرام کا حال ہم لوگوں کی طرح نہیں تھا کہ ایک وقت میں اتنا کھالیا کہ اگر ایک دو وقت کھانا نہ ملے تب بھی کام چل جائے، جیسا کہ رمضان میں سحری میں اتنا کھالیا جاتا ہے کہ پورے دن کچھ پتہ نہیں چلتا، اُس زمانہ میں جو ایک وقت کا کھانا میسر ہوتا تھا وہ اتنا ہوتا تھا کہ بس اسی وقت کی ضرورت پوری ہوسکے، اب ظاہر ہے کہ دوسرے وقت میں بڑی شدت سے بھوک لگتی ہوگی۔

یہ انتہائی ایثار کا واقعہ ہے، اور اس طرح کے واقعات حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے نہ جانے کتنے ہیں، ایک صحابی کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے شدت پیاس میں خود اپنی جان دے دی مگر پانی پینے میں دوسرے صحابی کو ترجیح دی، واقعہ یہ ہے کہ یہ سب انتہا درجہ کی

بات ہے، اور یہ واقعات اسی لیے نقل کیے جاتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ ہم لوگوں کو بھی حاصل ہو، اگر آج آدمی اپنی جان نہیں دے رہا، اور نہیں دے سکتا تو کم از کم تھوڑی قربانی ضرور دے سکتا ہے، ان واقعات سے یہی مزاج بنایا گیا ہے، اور اسی لیے ایثار کے یہ واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

نبوی ایثار کا ایک نمونہ:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت بُنی ہوئی چادر لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور عرض کیا کہ اللہ کے نبی! آپ کو پہنانے کے لیے یہ چادر میں نے اپنے ہاتھ سے بنی ہے، حضور ﷺ نے وہ چادر قبول فرمالی، اس وقت آپ کو اس کی ضرورت تھی، پھر وہی چادر زیب تن فرما کر ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے، ایک شخص نے کہا: یہ چادر آپ ہمیں عنایت فرمادیں، یہ تو بڑی خوبصورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا، پھر آپ مجلس میں بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد واپس تشریف لے گئے، اور چادر تہہ کر کے اس شخص کو بھیج دی، لوگوں نے اس شخص سے کہا: تم نے یہ اچھا نہیں کیا، آپ ﷺ نے اس کو زیب تن فرمایا، اور اس وقت آپ اس کے حاجت مند تھے، تم نے حضور ﷺ سے یہ چادر مانگ لی، حالانکہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ حضور ﷺ کسی سائل کو واپس نہیں فرماتے، اس شخص نے کہا: میں نے یہ چادر پہننے کے لیے نہیں مانگی، بلکہ اس لیے مانگی کہ مرنے کے بعد یہی میرا کفن ہو، حضرت سہل فرماتے ہیں: یہی چادر اس کا کفن بنی۔ (صحیح البخاری: ۱۲۷۷)

حضرت سہل بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں ایک خاتون آئیں اور ایک چادر پیش کی، اور یہ عرض کی کہ اللہ کے رسول! میں نے اپنے ہاتھوں سے اس چادر کو آپ کے لیے بنا ہے، آپ ﷺ نے وہ چادر بڑی خوشی سے قبول فرمائی، اور اس وقت آپ ﷺ کو ایسی چادر کی ضرورت بھی تھی، اس لیے کہ جو کچھ بھی مال آتا تھا وہ سب آپ ﷺ لوگوں کو ہدیہ دے دیتے تھے، اور آپ ﷺ کے پاس پہننے کے لیے ایک ہی چادر تھی، یا جو بھی بات تھی بہر حال اس وقت آپ ﷺ کو ایک چادر کی ضرورت تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے اس ہدیہ کو قبول فرمایا اور گھر میں تشریف لے گئے اور جب باہر تشریف لائے تو آپ وہی چادر زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔ مجلس میں ایک صحابی بیٹھے تھے وہ کہنے لگے: اللہ کے رسول! آپ کی چادر بڑی خوبصورت اور اچھی لگ رہی ہے، اگر آپ یہ چادر مجھے عنایت فرمادیں تو بہت اچھا ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: بہت خوب، مناسب ہے، پھر آپ ﷺ کچھ دیر مجلس میں تشریف فرما رہے، اور جب گھر تشریف لے گئے تو اپنی چادر اتار کر اور تہا کر ان صحابی کو دے دی۔ اس مجلس میں جو صحابہ بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ان صحابی سے کہا: تم نے اچھا نہیں کیا، تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ کو اس وقت چادر کی ضرورت تھی، اور جو چادر آپ کو دی گئی آپ نے اس کو فوراً لے جا کر استعمال فرمایا، ایسی صورت میں تمہیں چادر نہیں مانگنا چاہیے تھا، اور تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو کہ حضور ﷺ سے محض خواہش کا بھی اظہار کر دیا جائے تو آپ کبھی رد نہیں فرماتے، اور اس وقت آپ ﷺ کو اس چادر کی سخت ضرورت تھی، اسی لیے فوراً آپ نے وہ چادر استعمال فرمائی، پھر تم نے کیوں اس کو مانگا؟ لیکن وہ بھی اللہ کا بندہ عجب تھا، کہنے لگا: میں نے چادر پہننے کے لیے نہیں مانگی ہے، محض اس شوق سے مانگی ہے کہ یہ چادر آپ ﷺ کے جسد اطہر سے مس کر چکی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ یہ چادر میرا کفن بنے، حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا، جب ان کا انتقال ہوا تو اسی چادر میں ان کو کفن دیا گیا۔

نبوی مزاج:

نبی اکرم ﷺ کا ایثار انتہائی اعلیٰ درجہ کا تھا، اس سلسلہ میں عجیب عجیب قسم کے واقعات ہیں، بدوؤں نے تو کوئی کسر ہی نہ چھوڑی تھی، کوئی بدو کہتا کہ اے محمد! اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں جو مال دیا ہے، اس مال میں سے ہمیں بھی دو، ان بدوؤں میں بعض منافق بھی ہوتے تھے، جن کا مقصود آپ ﷺ کو پریشان کرنا ہوتا تھا، لیکن آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ کسی کو رد نہیں فرماتے تھے، جو بھی ہے وہ دینا ہے، آپ فرماتے تھے کہ میرے پاس جو کچھ ہے میں دے ہی دیتا ہوں، میں خود کہاں رکھتا ہوں، روایات میں آتا ہے کہ بعض مرتبہ یہاں تک ہوتا تھا کہ بدو آپ ﷺ کے گلے کی چادر کھینچ رہا ہے اور اس کو مروڑ رہا ہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے گردن مبارک پر اس کے نشانات پڑ جاتے تھے، اور وہ کہتا رہتا تھا کہ آپ ہمیں مال دیجیے، لیکن آپ بڑی نرمی سے یہی فرماتے کہ اگر میرے

پاس ہوتا تو میں ضرور دیتا، میں یہ بالکل پسند نہیں کرتا کہ میں کسی کو نہ دوں، اور میں یہ بالکل نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے بخیل کہیں۔

اعلیٰ انسانی معیار:

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کے کہنے سننے کا بھی تھوڑا بہت خیال ہونا چاہیے، کام تو اللہ کی رضا کے لیے ہوتا ہے، لیکن کوئی ایسا طرز عمل کہ جس کے نتیجہ میں آدمی بالکل بے حیثیت ہو جائے، اور اس کی حیثیت گر جائے یہ بھی مناسب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آدمی کو شرافت دی ہے، یہ شرافت انسانی بھی ہے اور اسلامی بھی، ایک صاحب ایمان کو اس پر قائم رہنا چاہیے، اور یہ سمجھ کر قائم رہنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ ہمارا ایک دینی فریضہ ہے، جب ہم ایسا کریں گے تو اس سے ایک اچھا عملی نمونہ اور ایک اچھی تصویر لوگوں کے سامنے آئے گی، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے بخیل کہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ ﷺ کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، اور جو بھی آپ ﷺ کے پاس آتا تھا، آپ ﷺ اس کو نوازتے تھے۔

اسوۂ نبوی ﷺ:

اس حدیث سے ایک اسوہ یہ سامنے آیا کہ بہتر یہی ہے کہ آدمی کبھی سائل کی بات رد نہ کرے، اگر اس کے پاس زائد نہیں ہے، اور صرف اس کی اپنی ضرورت کی چیز ہے تو وہ اپنے پاس رکھ لے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی چیز کی خواہش کی ہے تو اگر دے سکتا ہو تو اس کی خواہش پوری کرے اور اس کو وہ چیز دے دے۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی اہلیہ صاحبہ کی یہی صفت تھی، اچھے سے اچھا کپڑا پہن کر آ گئیں اور کسی نے ذرا بھی کہہ دیا کہ آپ پر یہ کپڑا بڑا اچھا لگ رہا ہے تو فوراً پوچھتیں کیا تمہیں دے دوں؟ اب اگر جواب میں اس نے کہہ دیا: ہاں، تو فوراً اندر گئیں اور پرانا کپڑا پہن لیا، اور نیا کپڑا اس کو دے دیا، ایسا کئی مرتبہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے پاس ایک دو جوڑے سے زیادہ کبھی نہیں رہتے تھے، وہ دنیا سے بالکل مستغنی تھیں، ہم نے دینار و درہم سے ایسا مستغنی کم لوگوں کو دیکھا۔

مؤمنانہ اخلاق:

یہ ایسی صفت ہے جو اللہ کو پسند ہے کہ آدمی اللہ کے راستہ میں خرچ کرے اور جتنا بھی خرچ کر سکے بہتر ہے، بار بار یہ سوچنا کہ یہ مانگ رہا ہے، مانگتا رہتا ہے، اس کا یہی کام ہے، اور اس کو ضرورت ہے بھی یا نہیں، یاد رہے یہ اس کا اپنا عمل ہے، ایک طرف اس کو بتا دیا گیا ہے کہ کیا کرنا ہے، اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ مانگنے والوں کے ساتھ کل قیامت میں بہت برا سلوک ہونے والا ہے، قیامت کے روز ان کے چہروں پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہوگا، لہٰذا وہ ان کا ذاتی عمل ہے، لیکن دینے والے کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے، وہ بھی قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے، ارشاد ہے: ”اور ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور ضرورت مندوں کا حق ہوتا تھا۔“ جو بے چارہ ضرورت مند ہے اس کا حق ہے، اور ایک حق سائل کا بھی ہے، جو چاہے ضرورت مند نہ ہو لیکن اگر وہ مانگ رہا ہے، اور آپ دے سکتے ہیں تو اچھا یہی ہے کہ آپ اس کو دے دیں۔

بقیہ: قرآن مجید کا مقام اور اس کا پیغام

۔۔۔۔۔۔جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ پر اتنا بوجھ پڑتا تھا کہ آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے اور اگر کسی جانور پر سوار ہوتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ ٹوٹ جائے گی، کیونکہ اس میں اتنا وزن ہوتا تھا، اور اس کلام میں طاقت ہوتی تھی، تو کئی کئی مرحلوں سے گزر کر یہ کلام ہم تک پہنچا ہے، اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو دیا، دوسرا یہ ہے کہ فرشتے نے آ کر حضور ﷺ کو سنایا، لیکن اس وقت بھی یعنی فرشتے کا واسطہ ہونے کے باوجود بھی اس کا اتنا وزن تھا کہ آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، اتنا بوجھ معلوم ہوتا تھا، پھر اس کے بعد آپ ﷺ سے ہم لوگوں کو ملا، اتنے واسطوں کے بعد یہ کلام ہم کو حاصل ہوا، جیسا کہ ابھی سطور بالا میں بجلی کی مثال دی گئی کہ وہ کرنٹ جو تار میں جا رہا ہے، اس کو ہم واسطے سے پکڑ لیتے ہیں، اگر اس کے اوپر کور (Cover) نہ ہو، تو ہم اس کو نہیں پکڑتے، اسی طرح اتنے واسطوں کے بعد یہ قرآن مجید ہم کو ملا ہے، ورنہ ہم کو براہ راست نہیں مل سکتا تھا، کیونکہ خالص اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے اس کی جو آسمانی طاقت ہے، وہ زمین والوں کی بس کی نہیں ہے، اس کو نہ ہی پہاڑ برداشت کر سکتا، نہ ہی زمین برداشت کر سکتی، لیکن چونکہ اللہ نے اس کو کئی واسطوں سے ہم تک بھیجا ہے، اس لیے ہم اس کو اٹھا سکتے ہیں اور پڑھ سکتے ہیں۔

ذلیل اور رسوا قوم

عبدالسبحان ناخدا ندوی

بنی اسرائیل کا سمندر پار کرنے کے بعد عبادت کے لیے بت مقرر کرنے کا معاملہ ہو یا گوسالہ پرستی کا، اسی طرح اللہ کو کھلم کھلا دیکھنے کا مطالبہ ہو یا من وسلوی سے اکتا کر سبزی، دال، ترکاری و پیاز کا مطالبہ کرنے کا معاملہ، اندازہ یہی ہے کہ پوری قوم اس میں شریک نہیں تھی، بلکہ ان کا ایک بڑا گروہ یہ کام کر رہا تھا، اور اب تک ان کا معاملہ کچھ فرمانبرداری اور بہت کچھ نافرمانی کا چل رہا تھا، اسی لیے قرآن مجید میں اللہ رب العزت کی ناراضگی اور سزا و تادیب کا تذکرہ ضرور ہے، لیکن ان پر ذلت تھوپنے کی بات نہیں کہی گئی۔

قرآن مجید میں جس جگہ بنی اسرائیل پر ذلت و بے چارگی تھوپنے کی بات کہی گئی ہے، اس کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب انہوں نے اصل مقصد سے منہ موڑا، اور اس میں چند ایک کو چھوڑ کر پوری قوم کا مجرمانہ کردار رہا، ان کو دراصل اپنی سرزمین کو آباد کرنا تھا اور وہیں تمام احکامات الٰہیہ کا نفاذ بھی کرنا تھا، لیکن جب ان سے اس کا مطالبہ کیا گیا اور اللہ رب العزت کے اس فرمان کے حوالہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مقدس سرزمین اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، اس لیے وہاں جاؤ تو پوری قوم ایک زبان ہو کر چلا اٹھی کہ ہم سے یہ نہیں ہوسکتا، اندازہ یہ ہے کہ یہ ان کی اجتماعی سب سے بڑی ہمہ گیر نافرمانی تھی، جو حضرت موسیٰ کے سامنے کھلم کھلا کی گئی، اس پر اللہ کا غصہ بھڑک اٹھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری قوم سے علیحدگی اختیار کی، اب تک معافی تلافی، رعایت اور درگذر کا جو انداز تھا وہ بدل گیا، اس لیے کہ یہ قومی خیانت تھی، اور اپنے اصل مقصد سے کھلا ہوا انحراف تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ دعا یا بددعا کرنی پڑی؛

{قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ} (المائدۃ: ۲۵)

(پروردگار! میں بس اپنا اور اپنے بھائی کا اختیار رکھتا ہوں تو ہمارے اور ان فاسق لوگوں کے درمیان جدائی ڈال دے)

بس یہاں سے بنی اسرائیل پر جو ذلت و بے چارگی تھوپی گئی وہ آج تک جاری ہے، درمیان میں اللہ کے احسانات بھی ہوئے، لیکن ذلت کی یہ کالک ہٹائے نہ ہٹ سکی، ارشاد الٰہی ہے:

{وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ} (البقرۃ: ۶۱)

(ان پر ذلت اور بے چارگی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں جا پڑے، یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیات کو ٹھکراتے تھے اور ناحق نبیوں کو قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ وہ سرچڑھ گئے اور وہ حد سے آگے بڑھ جایا کرتے تھے)

"ضرب" کا عام مفہوم مارنے کا ہے، اس لحاظ سے "ضربت علیہم الذلۃ" کا مطلب یہ ہوا کہ ان پر ذلت ماردی گئی، تھوپ دی گئی، گویا اس چیز سے دامن چھڑانا ان کے لیے ممکن نہ رہا، یہ تعبیر قرآن کریم نے دو جگہ استعمال کی ہے اور دونوں جگہ بنی اسرائیل سے یہود مراد ہیں۔

"الذلۃ" حقارت، پستی اور کمزوری، کسی کے دباؤ پر جھکاؤ کی کیفیت کو "ذلت" کہا جاتا ہے۔

"المسکنۃ" بے چارگی، کمزوری اور کسی کے سامنے جھکنے کو "مسکنت" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب حرکت کا بند ہونا ہے، چونکہ مسکین بے چارہ مالی لحاظ سے اتنا کمزور ہوتا ہے کہ گویا کسی حرکت کے لائق ہی نہیں رہتا، اسی لیے اسے "مسکین" کہا جاتا ہے، ذلت کا تعلق اندر سے زیادہ ہوتا ہے اور مسکنت کا تعلق باہر سے کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے، "الذلۃ" کے ساتھ "مسکنت" کو لا کر اللہ نے یہ بتادیا کہ وہ ظاہر باطن دونوں اعتبار سے پست کردیے گئے، انتہائی بے قیمت، بے وقعت اور حقیر بنادیے گئے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتادیا ہے کہ ان کو اگر اللہ کا سہارا یا انسانوں کا سہارا مل جائے تو وقتی طور پر ان کی ذلت و بے چارگی کچھ ہٹ سکتی ہے، ارشاد ہے:

{ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ} (آل عمران: ۱۱۲) (ان پر ذلت تھوپ دی گئی جہاں بھی یہ پائے جائیں (یعنی دنیا کا ہر کونہ ان کے لیے جائے ذلت ہے) ہاں اللہ کی

رسی اور لوگوں کی رسی کے ذریعہ (ان کی ذلت وقتی طور پر چھپ سکتی ہے) اور یہ اللہ کے غضب سے جا پڑے اور ان پر بے چارگی بھی دے ماری گئی)

اللہ کا سہارا ملنے کا مطلب ان کا اسلام قبول کرنا ہے، ایسی صورت میں ان کی ذلت عزت میں بدل جائے گی، اسی طرح اللہ کی طرف سے کچھ مدت ان کو سانس لینے کی مل جائے تو یہ بھی اللہ کا سہارا قرار دیا جاسکتا ہے، دوسری طرف اگر کوئی بڑی طاقت ان کی سرپرستی کرے (جسے لوگوں کا سہارا کہا گیا ہے) تو پھر کچھ دیر کے لیے ان کی تار تار عزت کی کچھ مرہم پٹی ہوسکتی ہے۔ آج کل اتفاق سے وہی زمانہ چل رہا ہے، جب کہ امریکہ و یورپ اپنی ساکھ داؤں پر لگا کر ان کی ساکھ بچانے کی کوششوں میں ہیں، قوموں کی زندگی میں سو پچاس سال کوئی طویل مدت نہیں ہوتی، بس عارضی عزت کا پردہ سرکنے کی دیر ہے، اصل ذلت کی سیاہی ایک مرتبہ پھر ان کے چہروں پر تھوپی جائے گی، یہ بات قابل فکر ہے کہ جب ''حبل اللہ'' کے اصل وارث و امین یعنی اہل اسلام ''حبل اللہ'' کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے تو ان کی عبرت کے لیے اللہ کی رسی دشمنوں کے لیے ڈھیلی کی جاتی ہے، اور ان پر غیروں کو مسلط کر دیا جاتا ہے، قرآن اس پر شاہد ہے، افسوس ہے کہ ہم لوگ فی الوقت اسی دور سے گذر رہے ہیں جب اللہ کی رسی دشمنوں کے لیے ڈھیلی کر دی گئی ہے۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ آسکتا ہے کہ یہود تو ہمیشہ مالدار رہے ہیں، یہاں تک کہ جب ان کی حکومت نہیں بنی تھی اس وقت بھی بڑے مالدار تھے پھر مسکنت تھوپنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہود میں جو مالدار ہیں وہ بے پناہ دولت کے مالک ہیں، لیکن ان کی اکثریت خستہ حال لوگوں پر مشتمل ہے، البتہ ہم موجودہ دور میں دیکھتے ہیں تو ان میں ایک مختصر تعداد کو چھوڑ کر بقیہ سب اچھے خاصے مالدار ہیں، لہٰذا اشکال اپنی جگہ پر قائم ہے، اس کا مناسب جواب یہی ہے کہ مسکنت حقیقت میں بے چارگی کو کہتے ہیں، مال کی کمی مسکنت کا سبب ہوسکتی ہے، لیکن مسکنت کی حقیقت نہیں، ہمارا مشاہدہ ہے کہ کتنے ایسے مالی لحاظ سے کمزور لوگ ہیں جو غیرت و خودداری میں مثال نہیں رکھتے، پورے وقار اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، وہ ٹوٹ سکتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے، اور کتنے ایسے مالدار ہیں جن میں خفت اور گراوٹ نظر آتی ہے، ان کی ایک ایک ادا سے مسکنت ٹپکتی ہے، ایسے لوگ نہایت درجہ طماع، حریص اور بزدل ہوتے ہیں، کوئی چھوٹا سا معاملہ پیش آجائے تو قدموں پر لوٹنے کے لیے تیار، یہاں اس آیت میں وہی مسکنت مراد ہے، علامت مسکنت یعنی مال کی کمی بھلے نہ بھی پائی جائے، لیکن حقیقت میں بے بسی و بے کسی ان پر تھوپ دی گئی ہے، اس لیے بہت مالدار ہونے کے باوجود یہود ذلیل ہوتے رہے، ہر جگہ سے نکالے جاتے رہے، دربدر کی ٹھوکریں کھانا ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا، فی الوقت لوگوں کے سہارے کچھ عزت دار نظر آتے ہیں، لیکن ذلت و مسکنت کا مکروہ چہرہ چھپائے نہیں چھپ رہا ہے۔

''باء وا بالغضب من اللہ'' کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے غضب الٰہی کو اپنا ٹھکانہ بنالیا، اس میں دوام اور تسلسل اور استقرار کا مفہوم پایا جارہا ہے، گویا یہ لوگ ہمیشہ زیر عتاب رہیں گے، اور اپنے کرتوتوں کی پاداش میں مستقل اللہ کی لعنت و غضب کے مستحق، اسی لیے حدیث پاک میں ان کی صفت ہی ''المغضوب علیہم'' (جن پر غضب الٰہی ثابت ہے) قرار دی گئی۔

''ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ'' اور ''باء وا بغضب من اللہ'' یہی دونوں تعبیرات دوام اور ہمیشگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اس کی وجہ خود قرآن نے کفر، قتل انبیاء، عصیان و سرکشی اور حد کو پھلانگنا قرار دی ہے، یہ بات ملحوظ رہے کہ یہاں حکم اکثریت پر لگایا جارہا ہے، اور ان کی مزاجی خرابی اور بد باطنی کو ظاہر کیا جارہا ہے ورنہ یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد اس میں مسلسل پیغمبروں کا سلسلہ جاری رہا، اہل حق پیدا ہوتے رہے، ائمہ و پیشوا جنم لیتے رہے، اصلاح کی کوششیں مستقل جاری رہیں، ایک تعداد حق پر قائم رہی، یہ سارے کام ہوتے رہے، لیکن نفس پرستی، بد طینتی، حسد اور معصیت پسندی اس قدر جڑ پکڑ چکی تھی کہ ہر صحیح بات بتانے والا ان کو کانٹے کی طرح کھٹکتا اور ان کی آخری تمنا یہ ہوتی کہ کسی طرح اس کا وجود ہی ختم کر دیا جائے، اور اس سلسلہ میں صرف انبیاء ہی نہیں، بلکہ جو بھی عدل و انصاف کی فضا عام کرنا چاہتا وہ ان لوگوں کے نزدیک قابل گردن زدنی ٹھہرتا۔

رمضان المبارک

چند احکام ومسائل

ادارہ

روزہ میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال:

پیسٹ میں ذائقہ ہوتا ہے اور روزہ کی حالت میں کسی بھی چیز کے ذائقہ کو چکھنا مکروہ ہے، اس لیے روزہ کی حالت میں پیسٹ کرنے سے بچنا چاہیے، یہ کراہت سے خالی نہیں۔

روزہ میں دانت نکلوانا:

روزہ کے ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کا تعلق ایسی چیزوں سے ہے جو حلق کے نیچے پہنچتی ہو، دانت چونکہ حلق سے اوپر ہے اس لیے بذات خود دانت نکالنے میں کچھ حرج نہیں، لیکن عام طور پر دانت نکالتے ہوئے مسوڑھوں سے کافی خون آتا ہے اور یہ بھی امکان رہتا ہے کہ خون حلق سے نیچے چلا جائے تو ایسی صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا، اس لیے اگر شدید مجبوری نہ ہو تو بہتر ہے کہ روزہ کی حالت میں دانت نہ نکلوائے، شدید عذر کے بغیر روزہ میں دانت نکلوانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ روزہ کے فاسد ہونے کا سبب بن سکتا ہے اور جو باتیں روزہ کے ٹوٹنے کا باعث بن سکتی ہیں وہ کم از کم کراہت سے خالی نہیں۔

روزہ میں گوند تھوک سے تر کرنا:

روزہ کی حالت میں گوند کو اپنی زبان سے تر کرنا کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ اگر گوند کے اجزاء حلق سے نیچے چلے گئے تب تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر اس کے اجزاء حلق سے نیچے نہیں گئے تب بھی کم سے کم چکھنے کی کیفیت پائی گئی جو مکروہ ہے، ہاں اگر انگلی میں تھوک لے کر اس سے گوند کو تر کرلے تو کوئی حرج نہیں۔

روزہ میں میڈیکل ٹسٹ کرانا:

روزہ ایسی چیزوں سے ٹوٹتا ہے جو جسم میں داخل ہوں، ایسی چیزوں سے نہیں جو جسم سے باہر نکلیں، اس لیے میڈیکل ٹیسٹ کے لیے خون نکالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ’’الفطر مما دخل لا مما خرج‘‘ (روزہ اس سے ٹوٹتا ہے جو اندر جائے نہ کہ اس سے جو باہر آئے) نیز آپ ﷺ نے روزہ کی حالت میں پچھنا لگوایا ہے، یہ بھی گذشتہ زمانہ میں فاسد خون نکالنے کا ایک طریقہ تھا، اسی لیے فقہاء نے پچھنا لگانے کی وجہ سے روزہ نہ ٹوٹنے کی صراحت کی ہے۔

روزہ میں حلق کے اندر دھواں:

اگربتی کا دھواں منھ یا ناک میں نہیں لیا جائے، بلکہ دور رکھا جائے، اور بلا ارادہ دھواں منھ یا ناک میں داخل ہوجائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، اور اگر قصداً دھواں لیا جائے، ناک سے کھینچا جائے جیسا کہ عود وغیرہ کی دھونی لی جاتی ہے، تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

روزہ میں انجکشن اور گلوکوز:

جس شخص کو بیماری کی وجہ سے گلوکوز چڑھانا ضروری نہ ہو، محض تقویت کے لیے روزہ کی حالت میں گلوکوز چڑھانا ایک درجہ کی کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ روزہ کا رکن اپنے آپ کو غذا سے محروم رکھنا ہے، اور گلوکوز چونکہ غذائی ضرورت ہی کو پورا کرتا ہے، اس لیے گلوکوز چڑھانا گویا جسم کی غذائی ضرورت کو پورا کردیتا ہے، اس لیے محض تقویت کے لیے روزہ کی حالت میں گلوکوز یا انجکشن وغیرہ لگوانے سے بچنا چاہیے۔

روزہ میں گیس سونگھنا:

گیس سونگھنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، رسول اللہ ﷺ نے خوشبو سے روزہ دار کی ضیافت کرنے کی تلقین فرمائی ہے، جس میں ظاہر ہے کہ روزہ دار کا سونگھنا پایا جاتا ہے، فقہاء نے بھی روزہ میں خوشبو سونگھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

روزہ میں بام یا ابوفاس کا استعمال:

اگر اصل شئ کے بجائے صرف اس کا اثر جسم کے اندر پہنچتا ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، بام وغیرہ لگانے سے جسم کے اندر صرف اس کا اثر پہنچتا ہے، نہ کہ اصلی شئ، نیز وہ بھی جسم کے مسامات کے ذریعہ اندر جاتا ہے، اس لیے اس کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

روزہ میں انہیلر کا استعمال:

انہیلر لیتے ہوئے روزہ رکھ لیا جائے کہ اپنی طاقت وصلاحیت کے

مطابق حکم خداوندی کی اطاعت ہوجائے اور جو لوگ صاحب استطاعت ہوں وہ فدیہ بھی ادا کردیں کہ اگر روزہ کافی نہ ہو تو فدیہ سے اس کمی کی تلافی ہوجائے، جیسے منھ کے راستہ سے کسی چیز کا حلق سے نیچے پہنچانا روزہ کو توڑ دیتا ہے، اسی طرح ناک کے ذریعہ بھی کسی چیز کا پہنچانا روزہ کے لیے مفسد ہے، اسلیے انہیلر کی دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے۔

روزہ میں خون دینا:

روزہ کی حالت میں خون دینے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ خون دینے کی وجہ سے روزہ کو قائم نہیں رکھ سکے گا، اور اضطرار و مجبوری کی حالت نہ ہو تو خون دینا مکروہ ہے۔

روزہ کا کفارہ کیا اور کب؟

اگر کسی شخص نے روزہ رکھنے کی نیت ہی نہیں کی تھی تو یہ بہت بڑا گناہ ہے، اسے توبہ کرنا چاہیے اور ایک روزہ کی قضا کرلینی چاہیے، اور اگر روزہ کی نیت کرچکا تھا تو پھر بلا عذر جان بوجھ کر روزہ توڑ دے تو اب کفارہ یہ ہے کہ ایک روزہ کے بدلہ مسلسل ساٹھ روزے رکھے جائیں اور اگر روزے نہیں رکھ سکتا تو ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا ایسا کھانا کھلائے کہ وہ آسودہ ہوجائیں۔

ممسک حیض دوائیں:

اس سلسلہ میں بہتر یہی ہے کہ ایسی دوائیں استعمال نہ کی جائیں جو صحت کے لیے مضر ہیں کہ شریعت کی رخصتوں سے گریز اور اس کے لیے تکلف اختیار کرنا دین میں ایک طرح کا غلو ہے اور دین میں غلو کو منع کیا گیا ہے، تاہم اگر کسی عورت نے ایسی دواء استعمال کرلی اور اس کو خون نہیں آیا اور روزہ رکھ لیا، تو روزہ ادا ہوجائے گا۔

بھاپ کی شکل میں دوا کا استعمال:

نمونیہ اور بعض دوسرے امراض میں بھاپ کے ذریعہ بھی دوا استعمال کی جاتی ہے، یہ استعمال کبھی دوا کو پانی میں ڈال کر اور پانی کو کھولا کر اس کی بھاپ منھ اور ناک سے لے کر کیا جاتا ہے، اور کبھی یہ عمل بعض آلات کے ذریعہ کیا جاتا ہے، بہرحال بھاپ خواہ کسی آلہ کی مدد سے اندر لے جائے یا سادہ طریقہ سے، دونوں صورتوں میں روزہ ٹوٹ جائے گا، اس لیے کہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ عمداً دھواں حلق کے نیچے اتارنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ بات اس میں مکمل طور سے پائی جاتی ہے۔

بواسیری مسّوں پر مرہم کا حکم:

اگر پیچھے کے راستہ سے کسی دوا کا استعمال کیا جائے اور دوا موضع حقنہ تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے کہ فقہاء نے اس کو بھی منافذِ اصلیہ میں شمار کیا ہے، البتہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر دوا موضع حقنہ تک نہ پہنچے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ بواسیری مسوں پر کوئی دوا یا مرہم لگانے سے یا ان کو پانی سے تر کرکے چڑھانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، اس لیے کہ واقف کاروں کا کہنا ہے کہ بواسیری مسّے موضع حقنہ سے کافی نیچے ہوتے ہیں۔

تحقیق مرض کے لیے آلات کا استعمال:

اگر امراض کی تحقیق کے لیے پچھلی شرم گاہ میں کسی آلہ سے مدد لی جائے تو اگر یہ آلات خشک ہیں اور ان کا ایک سرا باہر ہے جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے تو ان آلات کے اندر داخل کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر آلہ پر کوئی تیل یا گریس جیسی چیز لگا کر اس کو داخل کیا گیا ہے تو روزہ فاسد ہوجائے گا۔

یہی حکم عورت کی اگلی شرم گاہ میں تحقیق کے لیے کسی آلہ کے داخل کرنے کا بھی ہے۔

رحم تک آلات پہنچانا:

رحم کی صفائی کے لیے اور فمِ رحم کو کشادہ کرنے کے لیے جو آلات (Dilators) استعمال کیے جاتے ہیں، اور اندرونی رحم کھرچنے کا آلہ (Curette) اگر ان پر کوئی تیل وغیرہ لگا کر ان کو داخل کیا گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اور اگر ان کو خشک داخل کیا گیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

لیکن اگر خشک داخل کرکے اور ایک مرتبہ باہر نکال کر دوبارہ صاف کیے بغیر ان کو پھر داخل کیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

مثانہ تک نلکی پہنچانا:

اگر مرد کے مثانہ تک نلکی پہنچائی جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، خواہ نلکی خشک ہو یا تر، اس سے دوا پہنچائی جائے یا نہیں، اور اگر عورت کے مثانہ میں نلکی پہنچائی تو اگر نلکی تر ہے یا اس سے دوا پہنچائی گئی تو روزہ ٹوٹ جائے گا، لیکن اگر نلکی خشک ہو اور اس سے دوا بھی نہ پہنچائی جائے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

زکوۃ کے مصارف

مفتی راشد حسین ندوی

زکوۃ کے مصارف خود قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کردیے گئے ہیں، ان مصارف کے علاوہ کسی اور جگہ زکوۃ کی رقم لگانے سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوگی، اور دوبارہ زکوۃ ادا کرنی ہوگی، مصارف کا بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ} (التوبۃ:۶۰) (زکوۃ تو حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور اس کے کام پر جانے والوں کا اور ان کا جن کی دلجوئی منظور ہے اور غلاموں (کے آزاد کرنے) میں، اور قرض داروں (کے قرض چکانے) میں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر (کی ضرورت) میں (اس کو خرچ کیا جائے) اللہ کی طرف سے طے شدہ، اور اللہ خوب جانتا ہے، بڑی حکمت رکھتا ہے)

اس آیت کریمہ میں آٹھ لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو زکوۃ دی جاسکتی ہے:

(۱) فقراء: جن کے پاس مال تو ہو لیکن اتنا نہ ہو جس سے وہ صاحب نصاب بن جائیں۔

(۲) مساکین: یہ لفظ مسکین کی جمع ہے، مسکین اس کو کہتے ہیں جو کسی بھی مال کا مالک نہ ہو۔

(۳) اسلامی حکومت کی طرف سے زکوۃ اور عشر وغیرہ کی وصولی پر مقرر کیے ہوئے افراد اور کارکنان، ان کو اجرت اور تنخواہ کے طور پر اتنا دیا جائے گا جس سے ان کی ضروریات پوری ہوجائیں، زکوۃ کا یہ مصرف ایسا ہے جس پر اس کے مالدار ہونے کے باوجود صرف کی جاسکتی ہے، ظاہر ہے یہ مصرف صرف اسلامی حکومت میں پایا جائے گا۔

(۴) مکاتب یعنی وہ غلام جس سے اس کے آقا نے معاہدہ کرلیا ہو کہ اتنی رقم دے دو تو آزاد ہوجاؤ گے، تو یہ بھی زکوۃ کا مصرف ہے، لیکن یہ مصرف ظاہر ہے غلامی کے خاتمہ کے بعد اب نہیں پایا جاتا۔

(۵) ایسا مقروض جس کے پاس دین کی ادائیگی کرنے پر نصاب کے بقدر مال نہ رہ سکے، اس قرض کی وجہ سے وہ بھی زکوۃ کا مصرف بن جائے گا۔

(۶) وہ مجاہدین اور غازیان اسلام جو نفقہ یا سواری وغیرہ ہلاک ہوجانے کے بعد فقر و احتیاج کے سبب اسلامی لشکر میں شامل ہونے سے عاجز ہوچکے ہوں، ان کو زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، جس سے وہ سواری اور زادراہ وغیرہ کا نظم کرسکیں۔

(۷) وہ مسافر جو سفر کے دوران ضرورت مند ہوجائیں، خواہ اپنے وطن میں صاحب نصاب ہی کیوں نہ ہوں، مثلاً: سفر کے دوران کسی کی جیب کٹ گئی اور تمام نقدی اور ٹکٹ وغیرہ اس کے پاس سے نکل گئے، گھر میں سب کچھ ہے لیکن کسی وجہ سے وہ گھر سے مال منگوانے پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو یہ شخص بھی زکوۃ کا مصرف ہے۔

(۸) اس آیت کریمہ میں ایک مصرف "مؤلفۃ قلوب" بھی بتایا گیا ہے، آنحضرت ﷺ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے، نو مسلموں کو اسلام پر جمانے کے لیے، یا کچھ قبائل کے شر سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے زکوۃ کی رقم صرف فرمایا کرتے تھے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں حضرت عمر کے مشورہ سے اس مصرف پر زکوۃ کی ادائیگی روک دی گئی، اس لیے کہ جس علت سے ان پر رقم صرف کی جاتی تھی، اسلام کے غلبہ کے بعد وہ علت باقی نہیں رہ گئی۔ (شامی: ۲/ ۶۴-۶۸، ہندیہ: ۱/ ۱۸۷-۱۸۸)

چند ضروری مسائل:

(۱) سب مصارف میں دینا ضروری نہیں: زکوۃ دینے والے کو اختیار ہے چاہے تو تمام مصارف میں لگائے یا کسی ایک میں لگائے، لیکن مالک بنا کر دینا ضروری ہے (شامی: ۲/ ۶۸، ہندیہ: ۱/ ۱۸۸)

لیکن ایک کو دینا افضل ہوتا ہے، بشرطیکہ اتنا نہ ہو کہ وہ صاحب نصاب بن جائے، اور مستحب یہ ہے کہ ایک فقیر کو ایک وقت میں کم سے کم اتنا دے کہ پھر دن بھر اس کو کسی سے مانگنا نہ پڑے اور وہ مقدار اس کے لیے اور اس کے عیال کے لیے کافی ہو، چنانچہ دار قطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کا فرمان موجود ہے کہ "آج کے دن ان کو غنی بنادو" اور کسی ایک فقیر کو اتنا دینا کہ وہ صاحب نصاب بن جائے مکروہ ہے، ہاں اگر وہ مقروض ہے تو دین ادا کرنے کے لیے بڑی مالیت بھی دی جاسکتی ہے، بس اس کا خیال رکھے کہ دین ادا کرنے کے بعد اس کے پاس نصاب کے بقدر نہ بچے، اسی طرح اگر کثیر العیال ہے، تب بھی زیادہ مقدار دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس کے

عیال پر مال تقسیم کیا جائے، تو ایک کے پاس نصاب کے بقدر مال نہ پہنچے۔ (ہندیہ: ۱/ ۱۸۸)

(۲) نیت ضروری ہے: زکوۃ ایک عبادت ہے، لہٰذا دوسری عبادات ہی کی طرح اس کی ادائیگی اسی وقت معتبر ہوگی جب نیت کے ساتھ ادائیگی کی گئی ہو، خواہ خود فقیر کو دیتے ہوئے زکوۃ کی نیت کی جائے، یا جب زکوۃ کا حساب کرکے مال زکوۃ الگ نکال کر رکھتے ہوئے نیت کی جائے، یا ایسے ہی کچھ مال زکوۃ کی نیت سے علاحدہ کرکے رکھتے ہوئے نیت کرے، بعد میں خواہ حاجت مند کو دیتے ہوئے نیت نہ بھی کرے، تب بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور اگر خود سے فقیر کو مال نہیں دیا، بلکہ کسی کو وکیل اور ذمہ دار بنا دیا کہ وہ مال فقیر کو دے دے تو وکیل کو دیتے وقت اگر زکوۃ کی نیت کرلی تو کافی ہے، لیکن اگر کسی حاجت مند کو کچھ رقم دے دی، بعد میں خیال آیا کہ ہمیں زکوۃ ادا کرنی تھی لاؤ زکوۃ کی نیت کرلیں تو اس میں تھوڑی تفصیل ہے، اگر فقیر وہ رقم خرچ کر چکا ہے تو اب نیت کرنا معتبر نہیں ہے، لیکن ابھی اگر رقم فقیر کے پاس موجود ہے تو نیت کی جاسکتی ہے۔ (شامی: ۲/ ۴، ہندیہ: ۱/ ۱۷۰-۱۷۱)

(۳) کن لوگوں کو زکوۃ دینا جائز ہے:

مندرجہ ذیل لوگوں کو زکوۃ دینا درست نہیں ہے:

۱- کافر کو، اس لیے کہ بخاری اور مسلم کی حدیث میں صراحت سے آیا ہے کہ زکوۃ مسلمان مالداروں سے لی جائے گی اور مسلمان حاجت مندوں پر صرف کی جائے گی۔

۲- اپنے اصول یعنی باپ، دادا، دادی، ماں، نانا، نانی وغیرہ کو۔

۳- اپنے فروع یعنی بیٹے، پوتے، پڑپوتے، بیٹی، نواسہ وغیرہ کو۔

۴- مالدار کو یعنی جو خود صاحب نصاب ہو، اسی طرح مالدار کی نابالغ اولاد کو بھی زکوۃ نہیں دی جاسکتی۔

۵- سادات کو جن میں بنو ہاشم یعنی حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عقیلؓ اور حضرت جعفرؓ وغیرہ کی اولاد شامل ہے، چنانچہ مسلم شریف کی حدیث میں صراحت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: محمد اور آل محمد کے لیے زکوۃ حلال نہیں ہے اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت حسنؓ جب بچہ تھے تو صدقہ کی ایک کھجور انہوں نے اپنے منہ میں رکھ لی، آنحضرت ﷺ نے وہ ان کے منہ سے نکلوادی، اور فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے لیے صدقہ حلال نہیں ہے۔

۶- بیوی اپنے شوہر کو یا شوہر اپنی بیوی کو۔

(ہندیہ: ۱/ ۱۸۸-۱۸۹، شامی: ۲/ ۶۹-۷۳)

(۴) زکوۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک ضروری ہے: زکوۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک ضروری ہے یعنی حاجت مند کو باقاعدہ مالک بنا دیا جائے، اس کے بغیر زکوۃ کی ادائیگی درست نہیں ہوگی، یہی وجہ ہے کہ زکوۃ کی رقم سے مسجد یا مدرسہ وغیرہ بنانا، رفاہی ضروریات مثلاً: راستہ یا پل اور ہسپتال جیسی چیز بنانا، یا میت کی تجہیز و تکفین کرنا، کسی غریب میت کا قرض ادا کرنا، یا اس کی رقم سے فقراء کی دعوت کرنا درست نہیں ہے، اور اس سے زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (شامی: ۲/ ۶۸)

(۵) زکوۃ کی رقم سے کوئی دوسری چیز لے کر دینا: یہ ضروری نہیں ہے کہ زکوۃ کی رقم بعینہٖ فقراء پر صرف کی جائے، بلکہ اگر سمجھ رہا ہے کہ حاجت مند کو فلاں چیز کی ضرورت ہے تو وہ چیز مال زکوۃ سے خرید کر مستحق کو دے دینے سے بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی، مثلاً: زکوۃ کی رقم سے کتابیں کاپیاں خرید کر بالغ غریب طلباء کو دینا، طلباء کا یونیفارم تیار کرکے مستحق کو دینا، غریبوں کو کپڑے یا ضرورت کا کوئی سامان زکوۃ کی رقم سے خرید کر دے دینا جائز ہے، یہاں تک کہ اگر زکوۃ کی رقم سے غریب کو گھر بنوا کر دے دیا جائے تب بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور چونکہ گھر کا مالک ہونے سے زکوۃ فرض نہیں ہوتی، لہٰذا اگر گھر تیار کرنے میں نصاب زکوۃ سے زیادہ رقم بھی صرف ہو جائے تب بھی اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ "وجاز دفع القیمة فی زکوة وعشر"

(شامی: ۲/ ۲۴، کتاب المسائل: ۲/ ۱۸۳-۱۸۴)

(۶) جب زکوۃ دینے میں غلطی ہو جائے: اگر کسی شخص کو زکوۃ کا مستحق سمجھ کر زکوۃ دی، بعد میں پتہ چلا کہ اس کو زکوۃ دینا درست نہیں تھا، تو اگر اچھی طرح غور کرکے زکوۃ دی تھی کہ وہ مستحق ہی ہے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی، اور بعد میں دوبارہ زکوۃ دینا ضروری نہیں ہوگا، مثلاً: مستحق سمجھ کر زکوۃ دی بعد میں پتہ چلا کہ وہ مالدار تھا، یا کافر تھا یا اس کا باپ تھا، یا اس کا بیٹا تھا، یا اس کا تعلق بنو ہاشم سے تھا یا وہ اس کی بیوی یا شوہر تھا، تو زکوۃ شرعاً ادا ہو جائے گی، لیکن اگر تحری اور غور و فکر کے بغیر ان لوگوں کو زکوۃ دے دی تھی تو ادا نہیں ہوگی اور پھر سے دینا ہوگا۔ (شامی: ۲/ ۷۴)

(۷) زکوۃ دینے میں قرابت داروں کا خیال رکھنا: اوپر جن رشتہ داروں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے یعنی

اصول، فروع اور زوجین، ان کے علاوہ بقیہ رشتہ داروں کو زکوۃ دینا نہ صرف جائز بلکہ زیادہ باعث ثواب ہے، ان کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کرنے کا بھی ثواب ہوتا ہے، جیسے بھائی، چچا، پھوپھی، بہن، سوتیلی ماں، بہو اور داماد وغیرہ، بس شرط یہ ہے کہ وہ مستحق زکوۃ ہوں۔ (شامی: ۲/ ۶۹)

(۸) زکوۃ کہہ کر دینا ضروری نہیں ہے: زکوۃ دیتے وقت یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے، چنانچہ اگر تحفہ وغیرہ کے نام سے زکوۃ دی جائے اور دل میں زکوۃ کی نیت رکھی جائے تو زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ (ہندیہ: ۱/ ۱۷۱)

حیلۂ تملیک: اگر کسی جگہ رقم صرف کرنے کی سخت ضرورت ہے اور زکوۃ کی رقم کے علاوہ کوئی دوسری رقم سے صرف کرنا ممکن نہیں ہے اور وہ چیز ایسی ہے جہاں زکوۃ صرف نہیں ہوسکتی، مثلاً: کسی غریب کی تجہیز وتکفین کی ضرورت ہے یا کسی جگہ مدرسہ یا مسجد کی تعمیر وغیرہ ناگزیر ہے تو ان چیزوں میں سیدھے طور سے زکوۃ نہیں لگ سکتی، البتہ سخت ضرورت ہو تو کوئی حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے، مثلاً: زکوۃ کی رقم کسی غریب کو دے دی جائے اور وہ اس مصرف میں لگادے۔ (شامی: ۱/ ۶۹)

۱- جب پورا مال صدقہ کردیا: زکوۃ کی ادائیگی شرعاً اس وقت تک نہیں مانی جاتی، جب تک مستحق کو مال دیتے وقت زکوۃ کی نیت نہ ہو، لیکن اگر کسی صاحب نصاب نے سال مکمل ہونے کے بعد پورا مال نصاب صدقہ کردیا تو اس کے ذمہ سے اس نصاب کا فریضہ ساقط ہوجائے گا۔ (ہندیہ: ۱/ ۱۷۱، البحر الرائق: ۲/ ۳۶۸)

۲- پیشگی زکوۃ ادا کرنا: اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہے تو اگر وہ ایک سال یا کئی سال کی پیشگی زکوۃ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، لیکن اگر بعد میں مال میں اضافہ ہوگیا تو اس کی زکوۃ الگ سے نکالنی ہوگی۔ (ہدایہ: ۱/ ۱۹۴، شامی: ۲/ ۲۹)

۳- گروی رکھی ہوئی چیز کی زکوۃ: اگر زکوۃ کے مال میں سے کوئی چیز خواہ وہ زیور ہو یا کوئی اور چیز کسی قرض وغیرہ کے بدلہ میں گروی رکھی ہوئی ہے تو اس کی زکوۃ نہ راہن (گروی رکھنے والے) پر ہوگی، نہ مرتہن (جس کے پاس سامان گروی رکھا گیا) پر، اس لیے کہ زکوۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب ملکیت تامہ پائی جائے، اور گروی رکھے ہوئے سامان پر کسی کو بھی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے، راہن سامان کا مالک تو ہے لیکن سامان اس کے قبضہ میں نہیں ہے، اور مرتہن سامان پر قابض ہے لیکن اس کو سامان کی ملکیت حاصل نہیں ہے، پھر جب راہن قرض کی ادائیگی کرکے سامان کو چھڑالے تب بھی گزشتہ سالوں کی زکوۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ (شامی: ۲/ ۷، ہندیہ: ۱/ ۱۷۲)

مال تجارت کی زکوۃ میں فروخت کی قیمت کا اعتبار ہوگا: مال تجارت کی زکوۃ میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ خریداری کے دن کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ اعتبار اس سامان کی زکوۃ نکالنے کے دن کی قیمت کا کیا جائے گا، یعنی مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوۃ کا حساب کررہے ہیں، مثلاً: ایک پلاٹ تجارت کے لیے آپ نے ایک لاکھ روپیے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوۃ نکالی جائے گی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائے گی، اسی طرح خرید کی قیمت کے بجائے فروخت کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا، ہاں پھٹکر کے بجائے ہول سیل کے اعتبار سے قیمت کا اندازہ لگانا جائز ہے۔

(بدائع: ۲/ ۱۱۵، فقہی مقالات: ۳/ ۱۵۰-۱۵۲)

سونے چاندی میں بھی فروخت کی قیمت کا اعتبار ہوگا: سونے چاندی میں سنار کے یہاں سے زیورات خریدیں تو قیمت زیادہ رہتی ہے، اور بیچے جائیں تو اس کی قیمت قدرے کم ہوتی ہے، تو چونکہ سونے چاندی میں زکوۃ اصلاً وزن ہی کے اعتبار سے ہوتی ہے کہ ۴۰ر گرام چاندی میں ایک گرام، سو گرام میں ڈھائی گرام اور شریعت کی طرف سے اصلاً اسی وزن کا اعتبار ہے، لہٰذا قیمت سے ادائیگی کرتے وقت اسی کی فروخت والی قیمت کا اعتبار ہوگا، جس قیمت پر خریدا تھا، اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

(شامی: ۲/ ۲۴)

یہ بھی واضح رہے کہ اگر اموال تجارت کی قیمت الگ الگ شہروں میں مختلف ہوجاتی ہو تو مال جہاں پر موجود ہو، وہاں کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا، جہاں پر زکوۃ دینے والا موجود ہے، وہاں کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (شامی: ۲/ ۲۴)

سال مکمل ہونے کے بعد مال کا ضائع ہوجانا: اگر سال مکمل ہونے کے بعد پورا مال چوری ہوگیا یا کسی اور طریقہ سے ضائع ہوگیا تو اس کی زکوۃ معاف ہوجائے گی، لیکن اگر خود مال کو ہلاک اور ضائع کردیا تو زکوۃ معاف نہیں ہوگی، جب بھی بعد میں اس کے پاس مال آئے زکوۃ ادا کرے۔ (شامی: ۲/ ۲۲)

روزہ کے جسمانی و روحانی فائدے

حکیم قاضی خالد، ایم-اے

خالق کائنات نے تین اقسام کی مخلوق پیدا کی ہیں۔نوری یعنی فرشتے،ناری یعنی جن اور خاکی یعنی انسان جسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔دراصل انسان روح اور جسم کے مجموعے کا نام ہے اور اس کی تخلیق اس طرح ممکن ہوئی کہ جسم کو مٹی سے بنایا گیا اور اس میں روح آسمان سے لاکر ڈالی گئی۔جسم کی ضروریات کا سامان یا اہتمام زمین سے کیا گیا کہ تمام تر اناج غلہ پھل اور پھول زمین سے اگائے جبکہ روح کی غذا کا اہتمام آسمانوں سے ہوتا رہا۔ہم سال کے گیارہ ماہ اپنی جسمانی ضرورتوں کو اس کائنات میں پیدا ہونے والی اشیاء سے پورا کرتے رہتے ہیں اور اپنے جسم کو تندرست و توانا رکھتے ہیں۔مگر روح کی غذائی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے ہمیں پورے سال میں ایک مہینہ ہی میسر آتا ہے جو رمضان المبارک ہے۔

دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمان اسلامی و قرآنی احکام کی روشنی میں بغیر کسی جسمانی و دنیاوی فائدے کا طمع کئے تعمیلاً روزہ رکھتے ہیں تاہم روحانی تسکین کے ساتھ ساتھ روزہ رکھنے سے جسمانی صحت پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں جسے دنیا بھر کے طبی ماہرین خصوصاً ڈاکٹر مائیکل' ڈاکٹر جوزف' ڈاکٹر سیموئیل الیگزینڈر، ڈاکٹر ایم کلائیو، ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ، ڈاکٹر جیکب' ڈاکٹر ہنری ایڈورڈ، ڈاکٹر برام جے' ڈاکٹر ایمرسن، ڈاکٹر خان یمرٹ، ڈاکٹر ایڈورڈ لنکسن اور جدید سائنس نے ہزاروں کلینیکل ٹرائلز سے تسلیم کیا ہے۔کچھ عرصہ قبل تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ روزہ کے طبی فوائد نظام ہضم تک ہی محدود ہیں لیکن جیسے جیسے سائنس اور علم طب نے ترقی کی، دیگر بدن انسانی پر اس کے فوائد آشکار ہوتے چلے گئے اور محقق اس بات پر متفق ہوئے کہ روزہ تو ایک طبی معجزہ ہے۔

آیئے! اب جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں دیکھیں کہ روزہ انسانی جسم پر کس طرح اپنے مفید اثرات مرتب کرتا ہے۔

روزہ اور نظام ھضم : نظام ہضم جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک دوسرے سے قریبی طور پر ملے ہوئے بہت سے اعضا پر مشتمل ہوتا ہے اہم اعضا جیسے منہ اور جبڑے میں لعابی غدود، زبان، گلا، مقوی نالی limentary Canal یعنی گلے سے معدہ تک خوراک لے جانے والی نالی۔معدہ، بارہ انگشتی آنت، جگر اور لبلبہ اور آنتوں سے مختلف حصے وغیرہ تمام اعضا اس نظام کا حصہ ہیں۔جیسے ہی ہم کچھ کھانا شروع کرتے ہیں یا کھانے کا ارادہ ہی کرتے ہیں یہ نظام حرکت میں آجاتا ہے اور ہر عضو اپنا مخصوص کام شروع کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے موجودہ لائف اسٹائل سے یہ سارا نظام چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہونے کے علاوہ اعصابی دباؤ جنک فوڈز اور طرح طرح کے مضر صحت الم غلم کھانوں کی وجہ سے متاثر ہو جاتا ہے۔ روزہ اس سارے نظام ہضم پر ایک ماہ کا آرام طاری کر دیتا ہے اس کا حیران کن اثر بطور خاص جگر پر ہوتا ہے کیونکہ جگر نے نظام ہضم میں حصہ لینے کے علاوہ پندرہ مزید عمل بھی سرانجام دینے ہوتے ہیں۔ روزے کے ذریعے جگر کو چار سے چھ گھنٹوں تک آرام مل جاتا ہے۔یہ روزے کے بغیر قطعی ناممکن ہے کیونکہ بے حد معمولی مقدار کی خوراک یہاں تک کہ ایک گرام کے دسویں حصہ کے برابر بھی، اگر معدہ میں داخل ہو جائے تو پورا کا پورا نظام ہضم اپنا کام شروع کر دیتا ہے اور جگر فوراً مصروف عمل ہو جاتا ہے۔جگر کے انتہائی مشکل کاموں میں ایک کام اس توازن کو برقرار رکھنا بھی ہے جو غیر ہضم شدہ خوراک اور تحلیل شدہ خوراک کے درمیان ہوتا ہے۔اسے یا تو ہر لقمے کو سٹور میں رکھنا ہوتا ہے یا پھر خون کے ذریعے اس کے ہضم ہو کر تحلیل ہو جانے کے عمل کی نگرانی کرنا ہوتی ہے جبکہ روزے کے ذریعے جگر توانائی بخش کھانے کے سٹور کرنے کے عمل سے بڑی حد تک آزاد ہو جاتا ہے۔اسی طرح جگر اپنی توانائی خون میں گلوبلن (Globulin) جو جسم کے محفوظ رکھنے والے مدافعتی نظام کو تقویت دیتا ہے، کی پیداوار

پر صرف کرتا ہے۔

رمضان المبارک میں موٹاپے کے شکار افراد کا نارمل سحری اور افطاری کرنے کی صورت میں آٹھ سے دس پاؤنڈ وزن کم ہوسکتا ہے جبکہ روزہ رکھنے سے اضافی چربی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ وہ خواتین جو اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور موٹاپے کا شکار ہیں وہ ضرور روزے رکھیں تاکہ ان کا وزن کم ہوسکے۔ یاد رہے کہ جدید میڈیکل سائنس کے مطابق وزن کم ہونے سے بے اولاد خواتین کو اولاد ہونے کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ روزے سے معدے کی رطوبتوں میں توازن آتا ہے۔ نظامِ ہضم کی رطوبت خارج کرنے کا عمل دماغ کے ساتھ وابستہ ہے۔ عام حالت میں بھوک کے دوران یہ رطوبتیں زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہیں جس سے معدے میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔ جبکہ روزے کی حالت میں دماغ سے رطوبت خارج کرنے کا پیغام نہیں بھیجا جاتا کیونکہ دماغ میں خلیوں میں یہ بات موجود ہوتی ہے کہ روزے کے دوران کھانا پینا منع ہے۔ یوں نظامِ ہضم درست کام کرتا ہے۔ روزہ نظامِ ہضم کے سب سے حساس حصے گلے اور غذائی نالی کو تقویت دیتا ہے اس کے اثر معدہ سے نکلنے والی رطوبتیں بہتر طور پر متوازن ہوجاتی ہیں جس سے تیزابیت (Acidity) جمع نہیں ہوتی اس کی پیداوار رک جاتی ہے۔ معدہ کے ریاحی دردوں میں کافی افاقہ ہوتا ہے قبض کی شکایت رفع ہوجاتی ہے اور پھر شام کو روزہ کھولنے کے بعد معدہ زیادہ کامیابی سے ہضم کا کام انجام دیتا ہے۔ روزہ آنتوں کو بھی آرام اور توانائی فراہم کرتا ہے۔ یہ صحت مند رطوبت کے بننے اور معدہ کے پٹھوں کی حرکت سے ہوتا ہے۔ آنتوں کے شرائین کے غلاف کے نیچے محفوظ رکھنے والے نظام کا بنیادی عنصر موجود ہوتا ہے۔ جیسے انٹریوں کا جال، روزے کے دوران ان کو نئی توانائی اور تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ہم ان تمام بیماریوں کے حملوں سے محفوظ ہوجاتے ہیں جو ہضم کرنے والی نالیوں پر ہوسکتے ہیں۔

روزہ اور دورانِ خون: روزوں کے جسم پر جو مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر خون کے روغنی مادوں میں ہونے والی تبدیلیاں ہیں خصوصاً دل کے لئے مفید چکنا، ایچ ڈی ایل، کی سطح میں تبدیلی بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس سے دل اور شریانوں کو تحفظ حاصل ہوتا ہے اسی طرح دو مزید چکنائیوں، ایل ڈی ایل، اور ٹرائی گلیسرائیڈ کی سطحیں بھی معمول پر آجاتی ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان المبارک ہمیں غذائی بے اعتدالیوں پر قابو پانے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے اور اس میں روزوں کی وجہ سے چکنائیوں کے استحالے (میٹابولزم) کی شرح بھی بہت بہتر ہوجاتی ہے۔ یاد رہے کہ دوران رمضان چکنائی والی اشیاء کا کثرت استعمال ان فوائد کو مفقود کرسکتا ہے۔

دن میں روزے کے دوران خون کی مقدار میں کمی ہوجاتی ہے یہ اثر دل کو انتہائی فائدہ مند آرام مہیا کرتا ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ روزے کے دوران بڑھا ہوا خون کا دباؤ ہمیشہ کم سطح پر ہوتا ہے۔ شریانوں کی کمزوری اور فرسودگی کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک وجہ خون میں باقی ماندہ مادے (Remnanuls) کا پوری طرح تحلیل نہ ہوسکنا ہے جبکہ دوسری طرف روزہ بطور خاص افطار کے وقت کے نزدیک خون میں موجود غذائیت کے تمام ذرے تحلیل ہوچکے ہوتے ہیں اس طرح خون کی شریانوں کی دیواروں پر چربی یا دیگر اجزا جم نہیں پاتے جس کے نتیجے میں شریانیں سکڑنے سے محفوظ رہتی ہیں چنانچہ موجودہ دور کی انتہائی خطرناک بیماری شریانوں کی دیواروں کی سختی (Arteriosclerosis) سے بچنے کی بہترین تدبیر روزہ ہی ہے۔ روزے کے دوران جب خون میں غذائی مادے کم ترین سطح پر ہوتے ہیں تو ہڈیوں کا گودہ حرکت پذیر ہوجاتا ہے اور خون کی پیدائش میں اضافہ ہوجاتا ہے اس کے نتیجے میں کمزور لوگ روزہ رکھ کر آسانی سے اپنے اندر زیادہ خون کی کمی دور کرسکتے ہیں۔

روزہ اور نظامِ اعصاب: روزہ کے دوران بعض لوگوں کو غصے اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے دیکھا گیا ہے مگر اس بات کو یہاں پر اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان باتوں کا روزہ اور اعصاب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس قسم کی صورت حال انانیت (Egotistic) یا طبیعت کی سختی کی وجہ سے ہوتی ہے دورانِ روزہ ہمارے جسم کا اعصابی نظام بہت پرسکون اور آرام کی حالت میں ہوتا ہے نیز عبادات کی بجا آوری سے حاصل شدہ تسکین ہماری تمام کدورتوں اور غصے کو دور کردیتی ہیں اس سلسلے میں زیادہ خشوع وخضوع اور اللہ کی مرضی کے سامنے سرنگوں ہونے کی وجہ سے تو ہماری پریشانیاں بھی تحلیل ہوکر ختم ہوجاتی ہیں۔ روزہ کے دوران چونکہ

ہماری جنسی خواہشات علیحدہ ہوجاتی ہیں چنانچہ اس وجہ سے بھی ہمارے اعصابی نظام پر کسی قسم کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔

روزہ اور وضو کے مشترکہ اثر سے جو مضبوط ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اس سے دماغ میں دوران خون کا بے مثال توازن قائم ہوجاتا ہے جو کہ صحت مند اعصابی نظام کی نشاندہی کرتا ہے اس کے علاوہ انسانی تحت الشعور جو رمضان کے دوران عبادات کی مہربانیوں کی بدولت صاف شفاف اور تسکین پذیر ہوجاتا ہے اعصابی نظام سے ہر قسم کے تناؤ اور الجھن کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔

روزہ اور احتیاطی تدابیر: یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مندرجہ بالا فوائد تبھی ممکن ہوسکتے ہیں جب ہم سحر و افطار میں سادہ غذا کا استعمال کریں۔ خصوصاً افطاری کے وقت زیادہ ثقیل اور مرغن تلی ہوئی اشیاء مثلاً سموسے' پکوڑے' کچوری وغیرہ کا استعمال بکثرت کیا جاتا ہے جس سے روزے کا روحانی مقصد تو فوت ہوتا ہی ہے خوراک کی اس بے اعتدالی سے جسمانی طور پر ہونے والے فوائد بھی مفقود ہوجاتے ہیں بلکہ معدہ مزید خراب ہوجاتا ہے لہذا افطاری میں دسترخوان پر دنیا جہان کی نعمتیں اکٹھی کرنے کی بجائے افطار کسی پھل کھجور یا شہد ملے دودھ سے کرلیا جائے اور پھر نماز کی ادائیگی کے بعد مزید کچھ کھالیا جائے اس طرح دن میں تین بار کھانے کا تسلسل بھی قائم رہے گا اور معدے پر بوجھ نہیں پڑے گا۔ افطار میں پانی دودھ یا کوئی بھی مشروب ایک ہی مرتبہ زیادہ مقدار میں استعمال کرنے کی بجائے وقفے وقفے سے استعمال کریں۔ انشاء اللہ ان احتیاطی تدابیر پر عملدرآمد سے یقیناً ہم روزے کے جسمانی و روحانی فوائد حاصل کرسکیں گے۔

روزہ اور انسانی خلیات: روزے کا سب سے اہم اثر خلیوں کے درمیان اور خلیوں کے اندرونی سیال مادوں کے درمیان توازن کو قائم پذیر رکھنا ہے۔ چونکہ روزے کے دوران مختلف سیال مقدار میں کم ہوجاتے ہیں۔ خلیوں کے عمل میں بڑی حد تک سکون پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح لعاب دار جھلی کی بالائی سطح سے متعلق خلیے جنہیں اپی تھیلیل (Epithelial) سیل کہتے ہیں اور جو جسم کی رطوبت کے متواتر اخراج کے ذمہ دار ہوتے ہیں ان کو بھی صرف روزے کے ذریعے بڑی حد تک آرام اور سکون ملتا ہے جس کی وجہ ان کی صحت مندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ خلیاتیات کے علم کے نکتہ نظر سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ لعاب بنانے والے غدود گردن کے غدود تیموسیہ اور لبلبہ (Pencreas) کے غدود شدید بے چینی سے ماہ رمضان کا انتظار کرتے ہیں تاکہ روزے کی برکت سے کچھ ستانے کا موقع حاصل کرسکیں اور مزید کام کرنے کے لئے اپنی توانائیوں کو جلا دے سکیں۔

روزہ اور غیر مسلموں کے انکشافات:

اسلام نے روزہ کو مومن کے لئے شفا قرار دیا اور جب سائنس نے اس پر تحقیق کی تو سائنسی ترقی چونک اٹھی اور اقرار کیا کہ اسلام ایک کامل مذہب ہے۔

☆ فارماکولوجی کے ماہر ڈاکٹر لوتھر جیم نے روزے دار شخص کے معدے کی رطوبت لی اور پھر اس کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا اس میں انہوں نے محسوس کیا کہ وہ غذائی متعفن اجزا (food particles septic) جس سے معدہ تیزی سے امراض قبول کرتا ہے بالکل ختم ہوجاتے ہیں ڈاکٹر لوتھر کا کہنا ہے کہ روزہ جسم اور خاص طور معدے کے امراض میں صحت کی ضمانت ہے۔

☆ مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائیڈ فاقہ اور روزے کا قائل تھا اس کا کہنا ہے کہ روزہ سے دماغی اور نفسیاتی امراض کا مکمل خاتمہ ہو جاتا ہے روزہ دار آدمی کا جسم مسلسل بیرونی دباؤ کو قبول کرنے کیصلاحیت پالیتا ہے روزہ دار کو جسمانی کھینچاؤ اور ذہنی تناؤ سے سامنا نہیں پڑتا۔

غرضیکہ روزہ انسانی صحت کے لیے انتہائی فائدہ مند ہے۔ روزہ شوگر لیول' کولیسٹرول اور بلڈ پریشر میں اعتدال لاتا ہے اسٹریس و اعصابی اور ذہنی تناؤ ختم کرکے بیشتر نفسیاتی امراض سے چھٹکارا دلاتا ہے روزہ رکھنے سے جسم میں خون بننے کا عمل تیز ہوجاتا ہے اور جسم کی تطہیر ہوجاتی ہے۔ روزہ انسانی جسم سے فضلات اور تیزابی مادوں کا اخراج کرتا ہے روزہ رکھنے سے دماغی خلیات بھی فاضل مادوں سے نجات پاتے ہیں جس سے نہ صرف نفسیاتی و روحانی امراض کا خاتمہ ہوتا ہے بلکہ اس سے دماغی صلاحیتوں کو جلا مل کر انسانی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوتی ہیں روزہ موٹاپا اور پیٹ کو کم کرنے میں مفید ہے خاص طور پر نظام انہضام کو بہتر کرتا ہے علاوہ ازیں مزید بیسیوں امراض کا علاج بھی ہے۔

تجارت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نوعیت

محمد ارمغان بدایونی ندوی

نبی اکرم ﷺ کی مکمل زندگی اہل ایمان کے لیے اسوہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت کو وہ جامعیت عطا کی ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں، آپ کے عہد طفولیت سے لے کر وفات کے آخری دن تک کوئی لمحہ ایسا نہیں جو قابل تقلید نہ ہو۔ آپ ﷺ نے جس وقت میدان تجارت میں قدم رکھا، اس زمانہ میں تجارت کے مختلف ناجائز طریقے رائج تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان تمام غلط طریقوں سے محفوظ رکھا، جب کہ خود گھر میں چچا عباس بن عبد المطلب انہیں طریقوں پر قائم تھے، مگر اس سلسلہ میں نبی ﷺ کی طبیعت فطری نظام تجارت کی طرف مائل ہوئی اور خارجی یا داخلی کسی بھی شخصیت کا اثر قبول نہ کیا۔

حضور اکرم ﷺ یتیمی کے بندھن میں روز اول سے مربوط تھے، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ایک وافر مقدار میں خود اپنا مال لگا کر سرمایہ دارانِ مکہ کے ساتھ تجارت کرتے، لیکن آپ ﷺ باہمت، باحوصلہ، غیور، طاقتور اور محنتی تھے، اس لیے یہ بات عین مناسب تھی کہ آپ اپنی محنت سے کسب مال کرتے، جو کہ سابقہ انبیاء کی بھی سنت رہی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے کم سنی میں اجرت پر اہل مکہ کی بکریاں چرائیں، اور اس طرح اجارہ کی جائز شکل پر عمل کر کے تمام انسانیت کو ایک بہترین اسوہ عطا فرمایا۔

آپ ﷺ نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو شفیق چچا ابو طالب کے مشورہ سے آپ نے حضرت خدیجہ کے مال کو لے کر ملکوں ملکوں تجارت کی اور متعدد سفر کیے۔ آنحضرت ﷺ کے ان تجارتی اسفار کی شکل مضاربت کی تھی، اس لیے کہ حضرت خدیجہ کے متعلق مشہور بات تھی کہ وہ اپنا مال مضاربت پر دیتی تھیں:

”کانت خدیجة ذات شرف ومال کثیر وتجارة تبعث الی الشام فیکون عیرها کعامة قریش وکانت تستأجر الرجال وتدفع المال مضاربة“

(حضرت خدیجہؓ باعزت، دولت منداور تاجر خاتون تھیں، ان کا کاروان تجارت شام جاتا تھا اور وہ قریش کے کاروان تجارت کے برابر ہوتا تھا، اور وہ لوگوں کو اجرت پر رکھتی تھیں اور ان کو مضاربت پر مال دیتی تھیں۔) (طبقات ابن سعد: ۸/ ۱۶)

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب نبی اکرم ﷺ کی دیانت داری اور امانت داری کے چرچے سنے، تو خیال ہوا کہ اگر محمد (ﷺ) میرا مال تجارت لے کر سفر کریں، تو میں انہیں منافع میں سے اس سے دوگنا عطا کروں گی، جو میں دوسروں کو دیتی ہوں، یہ خوش کن خبر جب چچا ابو طالب کو پہنچی تو انہوں نے سعادت مند بھتیجے کو تجارت کا مشورہ دیا اور آپ ﷺ حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر ملک شام گئے، آپ کا یہ کامیاب سفر مضاربت کی نوعیت پر ہی مبنی تھا، اس میں حضرت خدیجہؓ نے حسب وعدہ دیگر مضاربین کے مقابل آپ ﷺ کو زیادہ منافع دیا تھا، ابن سعد کی روایت ہے:

”فأضعفت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضعف ما سمت له“ (أیضاً) (انہوں (حضرت خدیجہؓ) نے حضور ﷺ کو اس سے دوگنا مال عطا کیا جو انہوں نے طے کیا تھا)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تجارت مضاربت سے زیادہ اجارہ کی شکل میں تھی، یعنی تجارت میں منفعت کے اعتبار سے فیصد ملنا طے نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ نے متعین اجرت پر تجارت فرمائی تھی، مستدرک حاکم کی روایت ہے:

”استأجرت خدیجة رضوان اللہ علیها رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم سفرتین الی جرش کل سفرة بقلوص“ (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو بطور اجرت (مقام) جرش کے دو سفر کرائے، اور ہر سفر ایک اونٹ کے عوض تھا۔) (مستدرک حاکم: ۳۴۴۸)

ممکن ہے بعض اسفار آپ ﷺ نے بطور اجرت بھی کیے ہوں، جو کہ تجارت کی ایک جائز شکل ہے، لیکن یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ آپ ﷺ مضاربت پر تجارت کرتے تھے، اور جب تجارت میں خوب نفع ہوتا تھا تو حضرت خدیجہ اکراماً اونٹ وغیرہ سے بھی نوازتی تھیں، جس کو اجارہ کی صورت پر محمول کیا گیا ہے

(باقی صفحہ نمبر ۳۲ پر)

مسلمانوں کا عروج اور اس کے بنیادی اسباب

محمد نفیس خاں ندوی

اسلام جب ایک تعمیری و انقلابی نظریۂ حیات اور مکمل و مثالی نظامِ زندگی کی شکل میں سامنے آیا تو اس نے کفر و شرک، جاہلیت و جہالت، قبائلی عصبیت اور تمام غیر انسانی افکار و اعمال پر خطِ تنسیخ پھیر دی اور مثبت طور پر انسانوں کے لیے ایمان و یقین، حقیقت پسندی وحق پرستی، عالمگیر اخوت و مساوات اور ایک صالح و پاکیزہ تہذیب کا راستہ ہموار کیا، چنانچہ اسلامی تعلیمات کے نتیجہ میں ایک ایسی بے مثال تہذیب وجود میں آئی جس کا مکانی رقبہ اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک، اور زمانی وقفہ چودہ سو سال پر محیط ہے، زمان و مکان کی وسعت و آفاقیت اور اس تہذیب کے دوررس و دیرپا اثرات نے آفتاب کی روشنی، ماہتاب کی چاندنی، اور موسم کے تغیرات کی طرح پوری دنیائے انسانیت کو متأثر کیا، اور تقریباً تمام ہی انسانی تہذیبوں نے اس سے کسب فیض کیا۔

عروج کی بلندیوں تک پہنچنے کے بعد یہ عالمگیر تہذیب اپنی تمامتر خوبیوں کے ہوتے ہوئے زوال کا شکار ہوئی، زندگی کے ہر میدان میں انسانیت کی مسیحائی کے دعوں کے باجود ملکوں اور قوموں نے نہ صرف اس کو نظر انداز کیا بلکہ اس کی حقانیت و ابدیت پر بھی سوال کھڑے کیے، اور آج تاریخ کی سب بڑی حکومت نہ صرف اپنے وجود کو سہارنے میں مصروف ہے بلکہ دیگر ملکی و عالمی تہذیبوں کے ساتھ کشاکش میں بھی مبتلا ہے۔

آگے کی سطریں اسبابِ عروج کے ادراک کی ایک کوشش ہے تاکہ امت مسلمہ موجودہ صورتحال میں اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکے۔

عربوں کی حالت:

اسلام سے قبل عرب ایک وحشی اور غیر متمدن قوم تھے، تہذیب وتمدن سے ناآشنا، علم و ہنر سے بے گانہ، اخلاق و ادب سے دور، تہذیب یافتہ دنیا سے الگ تھلگ نہایت گمنام اور پست زندگی گذار رہے تھے، مہذب اور ترقی یافتہ ممالک سے ان کو تین طرف سے سمندر اور ایک طرف سے صحرا نے علیٰحدہ کر رکھا تھا، اس کے برعکس ایران و روم اس وقت دنیا کی خدائی کے دعویدار تھے، مشرق و مغرب کی زمام قیادت انہیں کے ہاتھ میں تھی، ان کے حدود مملکت عرب کو اس طرح گھیرے ہوئے تھیں جس طرح کلائی کو کنگن، عرب پر انھوں نے کبھی فوج کشی اس لیے نہیں کی کہ وہ کوئی ایسا ذرخیز اور دولتمند ملک نہیں تھا نیز وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی پر پیچ و سنگلاخ تھا، چنانچہ انھوں نے عربوں پر اپنا سیاسی تسلط ہی کافی سمجھا اور ان کی نگرانی کے لیے جابجا چوکیاں قائم کردیں۔

عراق، مصر و شام کے بازروں میں عربوں کی رسائی ضرور تھی لیکن وہ کسی شمار میں نہ تھے، منڈیوں میں ان کے گھوڑوں اور کھجوروں کو اہمیت حاصل تھے لیکن خود شہریوں کی نظر میں وہ عام دیہاتیوں سے زیادہ نہ تھے، کبھی کسی مجلس میں ان کا تذکرہ ہوتا تو ان کی چرب زبانی، ان کی فصاحت و بلاغت، گھوڑوں کی عمدگی وغیرہ چند باتوں کا ہی ذکر ہوتا جو عام طور پر غیر متمدن قوموں کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں۔

متمدن اقوام کی نظر میں عربوں کی حیثیت کو مؤرخین نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے اور خود عربوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر دمشقی نے ایرانی دربار میں شہنشاہ ایران اور مسلم قاصد کی گفتگو کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

”یزدگرد نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا: جہاں تک مجھے معلوم ہے تم دنیا میں سب سے زیادہ زبوں حال تھے، تمہاری تعداد بہت تھوڑی سی تھی، اور آپس کی خانہ جنگی اور باہمی اختلاف و افتراق میں بھی تم اپنی نظیر آپ تھے، بوقت ضرورت تمہاری سرکوبی کے لیے ہم قرب و جوار کے دیہاتوں کو حکم دیتے تھے اور وہی تمہارے لیے

کافی ہوتے تھے، ہمیں کبھی تمہارے لیے فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی،.....اگر تم بھوک اور فاقہ کشی سے پریشان ہو کر آئے ہو تو ہم تمہارے لیے راشن مقرر کر دیں تا آنکہ تمہارے حالات درست ہو جائیں۔"

مسلمانوں کے سفیر اور نمائندہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اس کے جواب میں کہا:

"اے بادشاہ! آپ نے جو کچھ ہمارے متعلق بیان کیا واقعہ یہ ہے کہ ہماری قوم کی برائیوں کا آپ کو پورا علم ہی نہیں، ورنہ ہماری حالت تو اس سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی، دنیا میں کوئی بھی قوم اتنے برے حال میں نہ ہوگی، ہم میں فقر و فاقہ اور افلاس اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے اور سانپ بچھو تک ہم کھا لیتے تھے، اور ان چیزوں کو اپنی غذا سمجھتے تھے، اللہ کی بچھائی ہوئی زمین ہی ہمارا پیدائشی گھر تھا، اور اونٹ یا بھیڑ بکریوں کی کھال سے جو کپڑا ہم بنا لیتے تھے وہی ہمارا لباس تھا، ایک کا دوسرے کو قتل کر ڈالنا ہمارا طریقہ تھا، ہم میں سے بعض لوگ اپنی لڑکیوں کو اس خوف سے کہ انھیں کھلانا پلانا پڑے گا زندہ فن کر دیا کرتے تھے، بے شک اب سے پہلے ہمارا یہی حال تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندہ کو رسول بنا کر ہماری طرف بھیجا....."

(البدایہ والنھایہ جلد ۷ صفحہ ۴۲-۴۳)

اس سے بھی بڑی شہادت یہ ہے کہ کسریٰ کے پاس جب آنحضرت (ﷺ) کا نامہ مبارک پہنچا تو اس نے نہایت تحقیر کے ساتھ اس کو پھاڑ ڈالا اور کہا کہ میرا غلام ہو کر مجھے اس طرح مخاطب کرتا ہے!

فتوحات کا سلسلہ:

تاریخی شہادتوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ شاہان روم و فارس، عربوں کو کس قدر حقیر اور کم حیثیت سمجھتے تھے، لیکن تاریخ اس بات کی بھی گواہ ہے کہ یہی عرب جب صحرا سے باہر نکلے تو فتح و نصرت نے ہر جگہ ان کا استقبال کیا، کامیابی نے ان کے قدم چومے، گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں، اور بڑی بڑی سرکش طاقتوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ عربوں کا یہ سیلاب اسلام کے دارالسلطنت مدینہ منورہ سے نکلا اور ہر اس چیز کو بہا لے گیا جو اس کے راستہ میں پڑ گئی، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میدانوں اور پہاڑوں کو اپنی آغوش میں لے لیا، اس سیلاب میں ہزاروں سال پرانی تہذیبیں بھی بہہ گئیں، بڑی بڑی منظم اور طاقتور سلطنتیں زیر و زبر ہو گئیں، صاحب اقتدار و پرشوکت قومیں بے نشاں ہو گئیں اور تاریخ میں صرف ان کا نام باقی رہ گیا۔

یہ عرب اپنے جزیرہ سے اس طرح نکلے تھے کہ ان کے کپڑے خستہ اور پیوند لگے ہوئے تھے، پیروں میں پھٹے پرانے جوتے، تلواروں کے نیام بوسیدہ اور پر تلے شکستہ تھے، بعض گھوڑوں کو زین بھی نصیب نہ تھی، وہ تہذیب و تمدن سے اس قدر ناآشنا تھے کہ کافور کو نمک سمجھ بیٹھے اور آٹے میں استعمال بھی کر لیا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہی خانہ بدوش دنیا کے حاکم ہو گئے، اور ان قوموں کو سرنگوں کر لیا جو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں امامت کے منصب پر تھیں، اونٹوں اور بکریوں کے چرواہے جہانبانی کرنے لگے، اور دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اقوام کے امام و پیشوا ہو گئے:

مشہور مؤرخ فشر (H.A.L Fisher) نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

"جزیرہ عرب میں کسی عربی سلطنت کا نام و نشان تک نہ تھا، نہ وہاں کوئی منظم فوج تھی اور نہ ان میں سیاسی شعور تھا، عرب شاعر تھے، مست ملنگ تھے، جنگجو تھے، تاجر تھے، لیکن سیاست سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا، ان کے دین میں اتنی قوت ہی نہ تھی جو انھیں متحد اور منظم کر سکے، وہ ایسے مشرکانہ نظام کے ماتحت زندگی گذار رہے تھے جو بے حد کمزور اور بے جان تھا.....صرف ایک صدی کی مدت میں ان وحشی و بے رحم عربوں نے حیرت انگیز عالمگیر اور عظیم الشان طاقت پیدا کر لی۔"

{A History of Europe By H.A.L Fisher, P.137}

عربوں کے خستہ حالات میں یہ عظیم الشان انقلاب، رسوا کن ضعف و ذلت کے بعد یہ زبردست طاقت و سربلندی، یاس و نومیدی کے بعد یہ جنون و تازگی، خواب غفلت کے بعد یہ بیداری تاریخ کا ایک نادر اور انوکھا واقعہ ہے، مؤرخین کا اتفاق ہے کہ تاریخ انسانی میں اس سے زیادہ عجیب و غریب واقعہ پیش نہیں آیا، بقول مشہور تجزیہ نگار مؤرخ اسٹوڈرڈ (Lothrop Stoddard) کے:

"تاریخ انسانی میں جس قدر واقعات مذکور ہیں اسلام کے ظہور کا واقعہ شاید سب سے زیادہ عجیب ہے، اسلام کا ظہور اس قوم میں ہوا جو بالکل غیر منظم اور پراگندہ تھی، اس ملک میں ہوا جو انحطاط کی آخری حد کو پہنچ چکا تھا، لیکن ابھی پوری ایک صدی بھی نہ گذری تھی کہ اسلام نصف

کرہ ارضی میں پھیل گیا، بلند وطاقتور ممالک کو اس نے زیر وزبر کر کے رکھ دیا، قدیم ترین مذاہب کو جو صدیوں بلکہ ہزاروں سال پیشتر سے قائم تھے ڈھادیا، انسانوں اور قوموں کی ذہنیت بدل دی، اور ایک نئے عالم کی بنیاد ڈالی جو انتہائی مضبوط اور طاقتور تھا- یہ عالم اسلام ہے"۔

{The New World of Islam: P.3}

عروج کے اسباب:

مسلمانوں کی فتوحات میں ان کے اخلاق عالیہ، ایمانی صفات اور ان کی مَلکی سیرت کا بنیادی رول رہا ہے، وہ ان اوصاف میں اس قدر معروف وممتاز تھے کہ جہاں کہیں بھی جاتے اور قیام کرتے ان کے اخلاق حسنہ اور ایمانی اوصاف مقدمۃ الجیش ثابت ہوتے، یہ اخلاق واوصاف مخالفین کے دلوں کو مسخر کر لیتے، کردار کی عظمت و محبت انسانی نفوس کو فتح کر لیتی، تلواروں، نیزوں اور بھالوں سے پہلے یہ خوبیاں اپنا کام کر جاتیں، جو لوگ ان کے اخلاق حسنہ اور حسن عمل کا مشاہدہ کر لیتے انھیں یقین ہو جاتا کہ یہ عام لوگ نہیں ہیں، یہ دوسروں سے ممتاز اور بہت ہی اونچی سطح کے لوگ ہیں، ایسے لوگ مغلوب نہیں ہو سکتے، عنقریب یہ دنیا پر چھا جائیں گے۔

ایمانی صفات اور اخلاق حسنہ کی اثر پذیری واثر آفرینی کے بعد تجزیہ نگاروں کے نزدیک تین بنیادی اسباب ہیں جن کے ذریعہ حکومتیں اور فوجیں اپنے حریفوں پر فتح وغلبہ پاتی ہیں:

۱-تعداد کی کثرت ۲-جنگی ساز وسامان ۳-عسکری تربیت

عرب اپنی آبادی اور رقبہ کے اعتبار سے بہت کم تھے، نیز جو جنگیں انھوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لڑیں وہ اپنے علاقہ سے باہر نکل کر لڑیں، وطن عزیز سے دور، مرکز اسلام سے جدا بالکل مسافرانہ حیثیت، جہاں بڑی دشوار ای اور طویل مدت کے بعد ہی کمک پہنچ سکتی تھی، ایسے میں ان کا سامانِ خورد ونوش اور ہتھیاروں کی مدد وہی تھی جسے وہ اپنے دشمن سے چھین سکتے تھے۔ اس برعکس عربوں نے جن ممالک پر لشکر کشی کی تھی وہ نہایت ہی زرخیز وشاداب ملک تھے، فوجوں کے جتھے بادلوں کی طرح امڈتے چلے آتے تھے، اور ملک کے ہر حصہ میں ان کو آسانی کے ساتھ رسد پہنچتی تھی، بالفرض اگر پورا جزیرۃ العرب بھی ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ کے لیے نکل آتا جو گرچہ عقلاً محال ہے تب بھی ایران وروم کے مقابلہ جو دنیا کی آبادی کا نصف حصہ تھے ان کی کوئی حیثیت نہ ہوتی، حالانکہ جو عرب ان سے جنگ کے لیے نکلے تھے ان کی مجموعی تعداد بیس فیصد سے بھی زیادہ نہ تھی۔

تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ مسلمان اور ان کے حریفوں کی تمام بڑی اور فیصلہ کن جنگوں میں فریقین کی تعداد میں کوئی تناسب نہ تھا، رومیوں اور ایرانیوں کی تعداد اکثر جنگوں میں کئی گنا زیادہ تھی۔ مسلمانوں کی قلت اور ان کے دشمن ایرانیوں اور رومیوں کی کثرت کا اعتراف تمام مؤرخین نے کیا ہے، کسی ایک مؤرخ نے بھی مسلمانوں کی فتح کے اسباب میں "عددی فوقیت" کا ذکر نہیں کیا ہے۔

جنگ یرموک میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پندرہ سے پچیس ہزار تک ذکر کی گئی ہے جبکہ رومیوں کی تعداد کم سے کم ایک لاکھ بیان کی گئی ہے، اس کا اعتراف خود مغربی مفکرین نے بھی کیا ہے:

"اس عہد کے عام مؤرخین اور خاص کر مسلم تاریخ دانوں نے ہرقل کے فوج کی تعداد کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ قرار دیا ہے جو کہ سب مسلح تھے..... مسلم افواج کی تعداد میدان جنگ میں پندرہ سے بیس ہزار کے آس پاس تھی"۔

{The Sword and Shield of God: By Stuart E. Mcallister, P.42}

قریب قریب یہی تناسب جنگ قادسیہ میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے مابین بھی تھا، تعداد کے اس عظیم تفاوت کے باوجود ان جنگوں کا نتیجہ مسلم تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

رہی بات ساز وسامان کی تو جنگی اسلحوں میں عربوں کی حالت اور بھی زیادہ کمزور وپست اور بے حیثیت تھی، نہ وہ منظم لشکر تھے اور نہ کسی حکومت کے باتنخواہ فوجی تھے کہ حکومت اپنی سطح پر اسلحہ وغیرہ مہیا کرتی اور کیل ٹانکے سے درست کر کے میدان جنگ میں روانہ کرتی۔

مسلمانوں کی بے سروسامانی، بوسیدہ لباس، پھٹے پرانے جوتے اور ان کے ضعیف ولاغر گھوڑوں کو دیکھ کر اہل ایران ٹھٹھا کرتے تھے، اور حیران بھی تھے کہ یہ خستہ حال لوگ کس طرح اس عظیم الشان لشکر کا مقابلہ کریں گے جو ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہے!

حضرت ابووائلؒ جو قادسیہ کی جنگ میں شریک تھے وہ بیان

کرتے ہیں:

"مجھے حتمی طور پر تو نہیں معلوم پھر بھی شاید ہماری تعداد سات آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی، جبکہ مشرکین کی تعداد تیس ہزار یا اس سے اوپر ہی تھی، وہ ہم سے کہتے تھے کہ تمہارے پاس نہ طاقت ہے نہ قوت ہے اور نہ اچھے ہتھیار ہی ہیں، تم نے یہاں آنے کی ہمت کیسے کی؟ جاؤ واپس چلے جاؤ۔ ہم نے کہا کہ ہم لوٹنے والے لوگ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے تیروں کو دیکھ کر ہنستے تھے۔" (البدایہ والنہایہ: ۷/ ۴۱)

جہاں تک تعلق ہے عربوں کے جنگی نظام و عسکری تربیت کا تو اس سے انکار نہیں کہ وہ جنگ کے خوگر تھے، دلیر و بہادر تھے اور اپنی انا کی خاطر چالیس سال تک جنگ کی بھٹی میں سلگنے کو بھی تیار تھے لیکن ان کی یہ ساری بہادریاں آپسی خانہ جنگیوں تک ہی محدود تھیں، روم و ایران سے ہمیشہ خائف رہتے اور ان عظیم سلطنتوں سے ٹکرانے کی کبھی جرأت نہ کر سکتے تھے، ان کی جنگی مہارتوں کا دائرہ بہت ہی محدود تھا، وہ حبشہ سے شکست کھا چکے تھے، ایران کے مطیع و فرمانبردار ہو چکے تھے اور جب ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تو نہ صرف بے بس ہو کر مکہ کو خالی کر دیا بلکہ خانہ خدا کی حفاظت سے بھی اپنا دامن جھاڑ لیا۔

معروف مؤرخ گستاو لی بون (Gustave Le Bon) کی یہ شہادت قابل ملاحظہ ہے:

"عرب فنون حرب سے بالکل ناواقف تھے، شجاعت و بہادری اس فن کی جگہ نہیں لے سکتی تھی، اور عربوں کی خانہ جنگیاں ان وحشیوں کے جنگوں کی طرح تھیں جو بغیر کسی تنظیم کے دشمنوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں، اور ان میں ہر کوئی ذاتی مفاد کے لیے لڑائی لڑتا ہے، اس کے برعکس اہل روم و ایران وہ تھے جن کو فنون حرب سے غیر معمولی واقفیت تھی اور جس کے جوہر انھوں نے عربوں کو پہلے ہی معرکہ میں دکھا دیے تھے۔" {La civilisation des Arabes P.125}

عرب کے بالمقابل روم و ایران کا جنگی نظام اس زمانہ میں بہت ترقی یافتہ تھا، روم کی بازنطینی حکومت ساتویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی، ایران و روم میں جو جنگیں ہوئیں ان سے دونوں کو بہت کچھ تجربات بھی ہوئے، جنگ کے نئے نئے طریقے معلوم ہوئے، اب ایسے میں یہ خیال کرنا کہ عرب اپنے قبائلی جنگوں کی وجہ سے اتنے مشاق اور طاقتور ہو گئے تھے کہ انھوں نے روم اور ایران کی شہنشاہیت کو شکست دے دی نہایت ہی غیر معقول بات ہے، کیونکہ اگر اس خیال کو صحیح مان لیا جائے کہ عربوں کی فتوحات کا راز ان کی جنگی قابلیت ہے تو یہ سوال اٹھنا یقینی ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل انھوں نے اپنے جزیرہ سے نکلنے اور دوسروں پر حملہ کرنے کی جرأت کیوں نہ کی؟ بعثت نبوی سے پہلے روم و ایران کے سامنے وہ سینہ سپر کیوں نہ ہوئے؟ صدیوں تک وہ ایران و روم سے لرزاں و خائف کیوں رہے؟

ایمان کی طاقت:

عربوں کی شاندار فتوحات اور تاریخ انسانی کے اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ صرف اور صرف وہ ایمانی طاقت ہے جس نے عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور ان کے اندر ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا، وہ پہلے کی طرح بے نظم اور لامذہب نہیں رہے، بلکہ وہ ایک زندہ مذہب کے حامل اور ایک زبردست قوت کے مالک ہو گئے، اللہ کے رسول (ﷺ) نے ان کی ایسی ایمانی تربیت فرمائی کہ ان کی دنیا ہی بدل گئی، وہ مع اپنے قلوب کے، مع اپنے ہاتھ پاؤں کے، مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

ایمان کی قوت نے عربوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا، وہ دنیا کے لیے اور دنیا ان کے لیے بالکل بدل گئی، جو دنیا ان کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث تھی اور جسے وہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اب ان کی نظروں میں وہ حقیر اور بے مایہ ہو گئی، جن قوموں اور جماعتوں کو وہ ہمیشہ عزت و احترام اور رشک و تعظیم کی نظر سے دیکھا کرتے تھے انسان کی صورت میں جانوروں اور چوپاؤں سے زیادہ ان کی حیثیت نہ بچی، ان کی ظاہری شان و شوکت، دنیوی ساز و سامان، اور ان کا ٹھاٹ و زینت سب حقیر ہو گیا۔

اب تک ان کی زندگیاں بے مقصد تھیں، ایمان کی دولت نے انھیں زندگی کا مقصد عطا کیا، ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ پختہ ہو گیا کہ وہ دنیا کے لیے نہیں بلکہ دنیا ان کے لیے برپا کی گئی ہے، اور وہ دین کے فروغ کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہیں، قوموں کی اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا ہے، اور اس حقیقت کا اعلان ان کے نمائندہ حضرت ربعی بن عامرؓ نے ایرانی لشکر کے سپہ سالار اعظم رستم کے دربار میں اس طور پر کیا کہ انھیں مرعوب کرنے کے لیے دربار کو خوب سجایا گیا

تھا، ہر طرف سنہرے اور ریشمی قالین بچھائے گئے تھے، موتی یاقوت سے بنی قیمتی اشیاء سجائی گئی تھیں، رستم اپنا قیمتی تاج پہنے ہوئے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا، اس وقت حضرت ربعی بن عامرؓ پھٹے پرانے کپڑے پہنے، تلوار اور ڈھال حمائل کیے ہوئے ایک معمولی اور پست قامت گھوڑے پر سوار دربار میں داخل ہوئے، اور دربار کی چمک دمک، رستم کی شان وشوکت اور درباریوں کی اکڑ بھوں کی کچھ پرواہ کیے بغیر پورے جوش اور وقار سے کہا:

”اللہ نے ہمیں مبعوث کیا ہے تاکہ ہم لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی کشادگی کی طرف رہنمائی کریں، اور مذاہب کی بے اعتدالیوں سے نکال کر اسلام کی صراط مستقیم پر گامزن کریں“

(البدایہ والنھایہ جلد ۷ صفحہ ۴۰)

ایمان کی قوت نے ان کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا کہ خدا ہی ان کی مدد کا ضامن ہے اور اس نے ان سے فتح ونصرت کا وعدہ کیا ہے اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا، انھیں خدا اور اس کے رسول پر پورا ایمان تھا، قلت وکثرت کا سوال ان کے لیے ہیچ ہوگیا، خطرات کا خوف ان کے دلوں سے جاتا رہا، اور ان کے اندرون میں ایسی بے پناہ قوت پیدا ہوگئی کہ کیسے ہی ناخوشگوار وناموافق حالات پیش آتے ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آتی، ان کے سکون واطمنان میں کوئی فرق نہ پڑتا، تعداد اور ساز وسامان کو وہ بے حیثیت سمجھنے لگے اور اسباب کی پرستش سے بے نیاز ہوگئے۔ ایمان کی اس عظیم طاقت کے ذریعہ انھوں نے وہ محیر العقول کارنامے انجام دیے کہ اگر تواتر کے ساتھ تاریخی شہادتیں نہ ہوتیں تو ان کی حیثیت من گھڑت کہانیوں اور تفریحی افسانوں سے زیادہ نہ ہوتی۔

معروف مستشرق میکس میرہوف (Max Meyerhof) اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

”ہمارے لیے یہ سمجھنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس طرح مختلف قبائل میں منقسم عربوں نے جو ضروری سامانِ جنگ سے بھی محروم تھے اس مختصر سی مدت میں ان رومیوں اور ایرانیوں کو شکست فاش دے دی جو اپنی تعداد اور سامان جنگ میں ان سے کئی گنا زائد اور فنون حرب میں ماہر تھے، اور ایک منظم لشکر کی حیثیت سے ان سے معرکہ آزما تھے۔“

بقیہ: تجارت نبوی (ﷺ) کی نوعیت

نبی ﷺ کو تجارتی اسفار میں خوب نفع حاصل ہوا، اور بعثت سے قبل تک آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال مضاربت پر لے کر مختلف جگہوں پر جاتے رہے، لیکن جب آپ کی مالی صورت حال مضبوط ہوگئی تو آپ ﷺ نے مشارکت پر بھی تجارت کی، یعنی کچھ افراد کے ساتھ اپنا پیسہ ملا کر تجارت کی اور منافع کو آپس میں برابر تقسیم کرلیا، سنن ابی داؤد کی روایت ہے:

”عن السائب قال أتيت النبي ﷺ فجعلوا يثنون علي ويذكرونني فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أنا أعلمكم، قلت: صدقت بأبي أنت وأمي كنت شريكي فنعم الشريك كنت لا تداري ولا تماري“

(حضرت سائبؓ سے مروی ہے کہ میں نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوا، تو صحابہ میری اچھائی بیان کرنے لگے اور میرا تذکرہ کرنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تم میں سب سے زیادہ ان کو جاننے والا ہوں، میں نے کہا: آپ سچ ہی کہتے ہیں، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! آپ میرے شریک تجارت تھے، اور آپ کیا ہی بھلے شریک تھے، نہ آپ جھگڑتے تھے اور نہ ہی بحث کرتے تھے)

ایک دوسرے صحابی حضرت قیس بن سائب رضی اللہ عنہ کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں: (حضور ﷺ زمانہ جاہلیت میں میرے شریک تجارت تھے، اور آپ واقعۃً ایک بہترین شریک (تجارت) تھے، نہ آپ بحث کرتے تھے اور نہ ہی جھگڑتے تھے۔) (اصابہ: ۵/ ۴۷۱)

آپس میں جھگڑنے اور بحث کرنے کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب مال میں سب کا حصہ ہو، اور اگر تجار کی ایک جماعت اپنا انفرادی مال لے کر کچھ سرمایہ داروں کی طرف سے تجارت کر رہی ہو تو ایک دوسرے سے بحث ومباحثہ اور لڑائی جھگڑے کا کوئی تصور ہی نہیں ہوسکتا، اور پھر حدیث میں لفظ ”الشریک“ (ساجھے دار) خود یہ بتا رہا ہے کہ آپ ﷺ نے بعثت سے قبل مشارکت پر بھی تجارت کی ہے۔ حاصل بحث یہ کہ آپ ﷺ نے ”اجارہ“ ”مضاربت“ اور ”مشارکت“ تینوں جائز طریقوں پر تجارت فرمائی ہے۔

محبت کی اکسیر

مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

محبت وہ اکسیر ہے جس سے ہر طرح کی کدورتیں اس طرح پگھل جاتی ہیں جیسے نمک پانی ہو جاتا ہے، یہ ایسی جادوئی چھڑی ہے جو سخت سے سخت دل کو موم کر دیتی ہے، سرکش طبیعتیں اس سے رام ہوتی دیکھی گئی ہیں۔ محبت ہی ہے جو دشمن کو دوست بنادے، بغض و نفرت کو محبت و اخوت سے بدل دے، دو دشمن دھڑوں کو جو دست بگریباں ہوں یک جان و یک قالب کر دے کہ جسم کے کسی حصہ کو تکلیف ہو پورا جسم بے خوابی اور بخار کا شکار ہو جائے۔

.....وہ چیز کہ مقناطیس کی طرح دل اس کی طرف کھنچیں، اور بڑے بڑے سرکش اس کے سامنے جھک جائیں وہ صرف محبت و اخلاص ہے، آپ کسی سے گفتگو کریں اور اس کے سامنے ہزار دلیلیں رکھیں اور معاملہ کو پوری طرح کھول دیں لیکن آپ کا دل چوب خشک ہو اور آپ کی زبان دھار دار تلوار ہو اور آپ کی باتیں زہر آلود تیر و نشتر کی طرح ہوں، تو آپ اپنے مخاطب کو مقصد سے دور کر دیں گے اور اس کے دل میں نفرت پیدا کر دیں گے، خواہ وہ آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

اس کے بالکل برخلاف آپ کہیں جا رہے ہوں، کوئی شخص راستہ میں ملے، آپ اس سے بغیر کسی دلیل اور حجت کے کوئی بھلی بات کہہ دیں، آپ کے چہرے پر مسکراہٹ ہو، سینے میں محبت کے جذبات ہوں، دل ایمان و یقین سے لبریز ہو، آپ اس کا دل جیت لیں گے اور اس کو اصل مقصد کے قریب کر دیں گے، اس وقت خواہ وہ ظاہری طور پر بات نہ مانے، لیکن ایک نہ ایک دن وہ ضرور آپ کی بات قبول کرے گا، اس لیے کہ آپ نے اس کے دل میں ایسا بیج ڈال دیا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن تناور درخت کی شکل میں آ کر ضرور پھل دے گا۔

آج کا سماج مشرق و مغرب میں اس صاف ستھری محبت کو نہیں جانتا، اور اس کی قیمت سے ناواقف ہے، اور اس نے انتہائی قیمتی دولت کا حقیر چیز سے سودا کر لیا ہے، اس نے صاف ستھری اور بلند و پاکیزہ محبت کا تجربہ کیا ہی نہیں، اور نہ اس کے مقصد سے واقف ہے، وہ صرف مادی اور ظاہری محبت کو جانتا ہے۔

اگر ہم نے نئے سرے سے اس کا علم بلند کیا اور اس دعوت کو انسانیت کے سامنے پیش کیا تو یہ انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی، ہم اس کو سخت حالات سے نکال سکیں گے، اور زوال سے بچا سکیں گے، یہ خالص مشینی زندگی جو ہر جگہ ایک چکی کی طرح چل رہی ہے، اور بیسویں صدی کا انسان جو اس پر راضی ہے کہ وہ گونگے بہرے ایک پرزہ کی طرح رات دن کام کرتا رہے، مال کماتا ہے تاکہ خرچ کرے اور خرچ کرتا ہے تاکہ اس سے زیادہ کمائے، یقیناً خانگی اور اجتماعی زندگی یورپ کے لیے آج جہنم بن گئی ہے، وہ محبت کے ایک ایک قطرہ کی پیاسی ہے جیسے بنجر زمین پانی کے ایک ایک قطرہ کی محتاج ہوتی ہے۔

اے محبت رکھنے والے مسلمانو! تم بنجر دلوں کے لیے ابر رحمت بن جاؤ، اللہ نے تمہیں محبت کی وہ سوغات عطا کی ہے جس سے سب کے دامن خالی ہیں۔

رحمت کا ابر بن کر جہاں بھر میں چھائیے — عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP -19

Volume: 11 ✦ MAY - JUNE 2019 ✦ Issue: 05-06

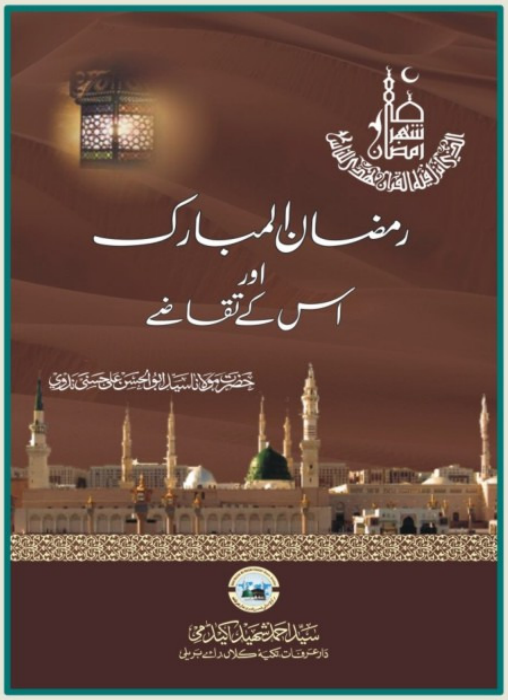

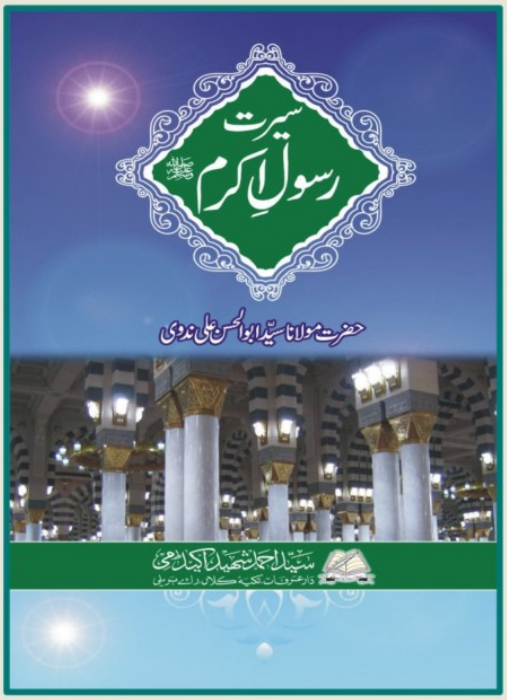

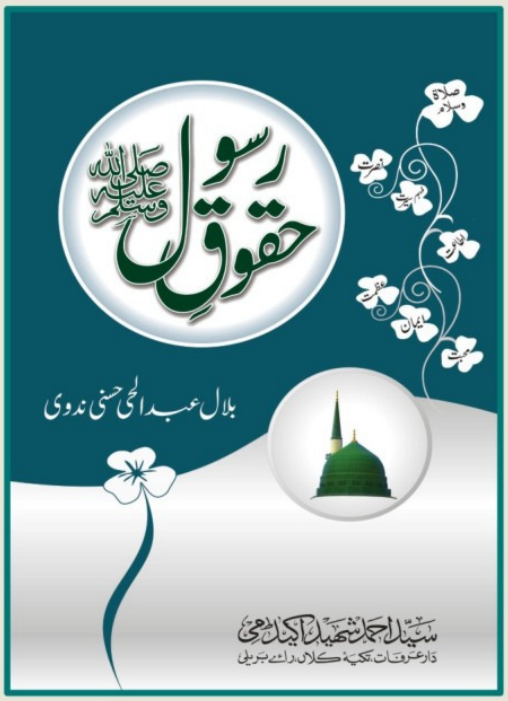

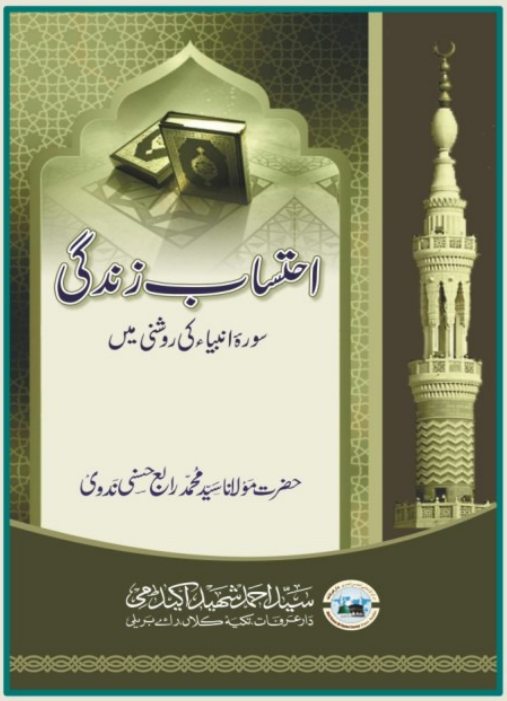

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)